احمد حسین شمس بمن گرامی

شخصیت اور فن

ڈاکٹر ایم، اے، آزاد عالم

احمد حسین شمسؔ بمن گرامی
شخصیت اور فن

ڈاکٹر ایم۔اے۔آزاد عالم

صدر شعبۂ اردو

آر۔ڈی۔ایس کالج،سالماری (کٹیہار)

ارم پبلشنگ ہاؤس

دریاپور،پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴

نام کتاب : احمد حسین شمس بمن گرامی شخصیت اور فن

مصنف : ایم،اے،آزاد عالم

سن اشاعت : ۲۰۰۶ء

تعداد : ۵۰۰

کتابت : روائل کمپوزنگ ورکس،سبھاش مارکیٹ لنگرٹولی چوراہا، پٹنہ۔۴

مطبع : ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ۔۴

ناشر : ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ۔۴

قیمت : ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

★ پروفیسر آزاد عالم، سالماری (کٹیہار) ۸۵۵۱۱۳

فون نمبر: 06451-248343

★ خورشید نیّر
★ ابوالفضل محمد ناصر
} کوثر منزل لائن، کشن گنج، بہار۔۸۵۵۱۰۷

★ بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

★ پرویز بُک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

★ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

انتساب

اپنے شفیق و مہربان دادا

مرحوم بدر العالم کے نام

جن کی بدولت آج میں اس مقام پر ہوں

اور

اپنی شریک حیات

عائشہ پروین کے نام

جن کی پُر خلوص معاونت نے

مجھے حوصلہ بخشا

آزاد

فہرست مضامین

فہرست مضامین

☆☆☆

حرف آغاز

احمد حسین شمس شخصیت اور فن'' آزاد عالم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ہے انہوں نے ایک ایسے ادیب کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے جو گمنامیوں میں رہ کر ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہا۔ آزاد نے تحقیق کا حق ادا کیا ان کا یہ کارنامہ بہار و جھارکھنڈ کے ادبی سرمایہ میں ایک اضافہ ہے۔

احمد حسین شمس کی داستان حیات نئی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ شمس ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر تھے، ناقد تھے، ناول نگار تھے۔ مذہبی افکار کے تجزیہ نگار تھے۔ انہوں نے کئی اصناف کو اپنی توجہ کا موضوع بنایا۔ ان کی غزلیں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی کڑوی سچائیوں کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ معاشرہ کی شکست و ریخت اور محرومیوں کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں رمزیت کے عناصر بھی ملتے ہیں اور حسن وعشق اور درد دل کی لطیف و نازک لہریں بھی موجزن ہیں۔ زبان کا یکی ہے اکثر ہندی کے الفاظ اور استعارے تہذیبی حسن کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ قطعات میں دردمندانہ اور اصلاحی رویہ کارفرما ہے۔

ان کی نظمیں عصری تناظر میں ایک کلاسیکی شعری جمالیت کا احساس دلاتی ہیں۔

وطن کی مٹی کی خوشبو ان کا سرمایہ ہے۔ معاشرتی نظام کی کشمکش، انسان کی نامرادیوں اور داخلی اضطراب کا اظہار نہیں متاثر کرتا ہے۔ عصری آگہی ایک نئی شناخت کے ساتھ ابھرتی ہے جس میں کہیں کوئی تصنع دکھائی نہیں پڑتا۔ وہ عصری حسیت کے ساتھ ایک پوری کائنات تخلیق کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہتے ہیں مگر ہندو دیو مالائی عناصر قاری کو کہیں کہیں مشکلوں میں ڈال سکتا ہے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کے تجربوں کی توانائی کا احساس دلاتی ہے۔

ان کی تنقیدی بصیرت میں استدلال کا خاصہ دخل ہے ادبی مضامین ہوں یا مذہبی اس میں تجزیاتی طریق کا استعمال بڑی چابک دستی سے کیا گیا ہے۔ مگر ناول نگاری میں کردار و واقعات کے ساتھ جو حسن انصاف کرنا تھا وہ نظریہ کی ترویج و اشاعت کے تلے دبتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کا ایک مزاحیہ ناول، ''رستم بھائی'' جمہوری ہندوستان کے معاشرتی خلفشار پر ایک گہرا نشتر ہے۔

شمس نے اپنی کنڈلیوں کے ذریعہ سیاسی شعبدہ بازی اور معاشرتی وتہذیبی و اخلاقی گراوٹوں اور انسانی کوتاہیوں کو اپنے طنز کا بطور خاص نشانہ بنایا ہے۔ شمس نے کنڈلیوں کو متعارف کیا ہے اس کے دامن کو وسعت بخشی ہے۔

شمس کی ادبی خدمات قابل توجہ ہے۔ اور مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔ آزاد عالم اس کارنامے کے لئے داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

علی امام

اعتراف

سیّد فرد الحسنؔ
قاضی محلّہ، شیر گھاٹی (گیا)

جناب ایم.اے. آزادعالم کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ جناب والا ایک لمبے عرصے سے درس وتدریس کا کام انجام دے رہے ہیں اور فی الوقت سالماری کالج، کٹیہار میں صدر شعبہ اردو ہیں۔

اردوادب کے تمام فن پاروں پر انکی گہری گرفت ہے اور جو کچھ لکھتے ہیں وہ مدلل اور قابل اعتبار ہوتا ہے۔ انکی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ کچھ نئی چیزیں سامنے آئیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے تحقیقی کام کے لئے بھی ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جو ہر صورت میں قابل احترام ہے لیکن ایک بڑی اردو آبادی اس نام سے غیر متعارف ضرور ہے اور وہ نام ہے جناب شمس بمن گرامی کا۔

شمس بمن گرامی اردو کے خود ساختہ مراکز سے دور رہ کر فن کی شمع جلانے اور اسے اپنے خون جگر سے زندہ رکھنے والوں کے زمرے میں شامل ہیں۔ ادبی، سیاسی اور سماجی سطحوں پر متحرک اور فعال رہ کر انہوں نے بلا شبہ ان کے لئے ایک مثال قائم کی ہے جو صرف وقت کی تنگی کا رونا روتے ہیں۔ ایم.اے. آزاد صاحب نے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ صرف ایک شاعر یا ادیب کے حالات نہیں بلکہ اس دور کی ادبی وتہذیبی تاریخ کے گمشدہ ابواب ہیں۔ ممکن ہے کسی کی نگاہ میں شمس بمن گرامی کی شخصیت ایسی نہ ہو جس پر کوئی تفصیلی کتاب پیش کی جائے یا ان کی نظروں میں کوئی عہد ساز شخصیت نہ رہے ہوں لیکن اگر کوئی اس کتاب کا مطالعہ اس پس منظر میں کرے کہ کشن گنج جیسی سنگلاخ زمین میں ادبی کاوشوں کے ذریعہ کسی نے گلہائے سخن یادگار چھوڑے ہیں۔ نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان بھر میں تعلیمی اعتبار سے سب سے پچھڑے ضلع کی حیثیت سے کشن گنج کی شہرت سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔

ایم.اے. آزاد نے جناب شمس کی غزلوں، نظموں، قطعات، کنڈلیاں، ناول، تنقید اور مذہبی تحریروں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا ہے اور ایک عمدہ بات یہ ہے کہ ہر طرح کی تحریر کا

انتخاب بھی شامل کتاب کر دیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک باذوق قاری ان سے خود اپنی رائے قائم کر سکتا ہے اور مصنف کے مفروضوں سے اتفاق یا انحراف کر سکتا ہے۔

اصناف شاعری کے حوالے سے ایم۔اے۔آزاد نے ان کی کنڈلیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ گر چہ یہ حصہ مزید تفصیل کا طالب تھا۔ اس کا صنفی ڈھانچہ اور فنی لوازم متعین کیا جانا ہنوز باقی ہے پھر بھی ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے کنڈلی کو اردو ادب میں متعارف کرانے کا کام اس کتاب کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ یہ صنف ہندی میں رائج ہے اور مزاح نگار شعرا، اس کا خاصہ استعمال کرتے ہیں۔ کاکا ہاتھرسی جیسے مشہور ہندی شاعر نے اس صنف کو ہندی مشاعروں کے سامعین کے درمیان قبولیت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ ممکن ہے اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد اردو شعرا، اور قارئین و سامعین بھی اسکی طرف متوجہ ہوں اور اس میدان میں شمس بمن گرامی کی اولیت ابھر کر سامنے آئے۔

اس کتاب سے شمس بمن گرامی کی کثیر الجہت شخصیت کے فکری اور لسانی پہلوؤں پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے ساتھ ہی ایم۔اے۔آزاد کے تنقیدی اور تحقیقی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جنہوں نے حتی الامکان ہر گوشے پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی سعی کی ہے۔

جناب عالم کا یہ کام یقیناً بڑا اہم کارنامہ ہے کہ انہوں نے ویسی شخصیت کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے جس کی جتنی پذیرائی کی جائے کم ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ جناب عالم نے اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ وہ جناب شمس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کریں اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

شمس کے ناولوں کے تذکرے میں ایم۔اے۔آزاد نے تفصیلات میں جانے سے گریز کی کوشش ضرور کی ہے جہاں ذرا تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان کے ذہن نے شمس کی ناول نگاری سے متعلق الگ موضوع کا انتخاب کیا ہو۔

بہرصورت پیش نظر کتاب نہ صرف یہ کہ لائق مطالعہ ہے بلکہ لائق احترام ہے کیونکہ یہ ایک ایسے فنکار سے متعلق ہے جس نے زندگی کی تمام تر صعوبتوں و جھیلا مگر اردو ادب کو مالامال کرتا رہا۔

اس بڑی شخصیت کو منظر عام پر لانے کے لئے جناب آزاد یقیناً قابل مبارکباد ہیں۔

★★★

گفتنی

احمد حسین شمس، شمس بمن گرامی کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق اس مقالے کی تکمیل میں مجھے پانچ برسوں تک منہمک رہنا پڑا۔ تحقیقی مقالے کے موضوع کے سلسلے میں شروع سے ہی میں نے اپنے استاد محترم ڈاکٹر محمد سلیمان صاحب پروفیسر وصدر شعبہ اردو بہار یونیورسیٹی، مظفر پور سے مشورہ کیا۔ انہوں نے نہایت اخلاص وانہاک کے ساتھ موضوع کے انتخاب میں میری رہنمائی فرمائی۔ اس موضوع کا انتخاب اور تعین موصوف گرامی ہی کے مشورے سے عمل میں آیا۔ اگرچہ میرے مقالے کے نگراں نے اس تحقیقی منصوبے کی راہ کی مشکلات سے مجھے آگاہ کیا تھا۔ لیکن میں ان کی پیچیدگیوں اور دشواریوں سے اس وقت صحیح طور پر واقف نہ تھا۔ تعلیم وتدریس کی مشغولیات کے باوجود میں نے عزم وحوصلے کے ساتھ اس منصوبے کی تشکیل وتکمیل کی کاوشوں کا آغاز کیا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ میری دقتوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ قدم قدم پر مخلصوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی نے آخرکار اس منصوبے کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچایا۔

پیش نظر مقالہ بعنوان احمد حسین شمس، شمس بمن گرامی شخصیت اور فن مجموعی طور پر دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں شخصیت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں شمس بمن گرامی کی شاعرانہ خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہوں نے جن صنفوں میں اپنی شاعرانہ قوت بیان کا مظاہرہ کیا، ان تمام اصناف کے حوالہ سے احمد حسین شمس، شمس بمن گرامی کی شاعرانہ خدمات کی تفہیم وتقویم کی گئی ہے۔ شاعری کے سلسلہ میں احمد حسین شمس، شمس بمن گرامی کی یہ خدمات بہر حال امتیازی نوعیت کی حامل ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں ان کے نثری کارناموں کے مطالعے اور جائزے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اس مقالے پر مجھے ڈاکٹریٹ کی سند بہار یونیورسیٹی سے حاصل ہوئی۔ مقالہ

شمس کی حیات میں مکمل ہوا۔ شمس کی وفات ۲۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء میں ہوئی ۔ یہ مقالہ ترمیم و تنسیخ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

آخر میں احمد حسین شمس بمن گرامی کی خدمات نثر و نظم کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اسکی نشاندہی کی گئی ہے کہ احمد حسین شمس، شمس بمن گرامی نے نظم و نثر کے مختلف اصناف واسالیب میں اپنی تخلیقی بصیرت اور بیانیہ قوت کی کشش انگیز اور معنی خیز تخلیق پیش کر کے اردو شعر و ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ بالخصوص بہار کے ادبی سرمائے میں انکی خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔ انکے معاصرین میں ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے اتنے متنوع اسالیب و اصناف میں اپنی تخلیقی بصیرت و ذہانت کا مظاہرہ کیا ہو۔ احمد حسین شمس، شمس بمن گرامی کی یہ تمام خدمات انکی بلند پایہ ادبی شخصیت کو ممتاز بنانے کے لئے کافی ہیں۔

میں نے اپنے موضوع کا حق ادا کرنے کی ہر ممکن کاوش کی ہے۔ میرے سامنے ایک مقصد یہ رہا ہے کہ احمد حسین شمس، شمس بمن گرامی کی ادبی شخصیت کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔ اسکے لئے نہ صرف یہ کہ شمس بمن گرامی کی مطبوعات اور انکے مسودات کو حاصل کر کے انکے تمام پہلوؤں کا احتساب کرنا پڑا ہے۔ بلکہ انکی ادبی شخصیت کی نشو ونما کے پس منظر میں جو روایات موجود تھیں۔ میں نے ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ روایات کی تقلید سے انحراف کر کے، ان کی توسیع و ترقی میں شمس بمن گرامی نے جو خدمات انجام دی ہیں، انکا صحیح مطالعہ ضروری تفصیلات و اطلاعات کے ساتھ سامنے آجائے۔ مجھے اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی، اسکی وضاحت تو میں نہیں کر سکتا لیکن اسکی نشاندہی ضرور کر سکتا ہوں کہ کئی برسوں کی جد و جہد کے بعد اب اپنا مقالہ مکمل کر لینے کے بعد مجھے اسکا احساس ہے کہ میں نے متعلقہ موضوع کے کسی گوشے سے صرف نظر نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر محمد سلیمان صاحب کا شکریہ ادا

کرنے کے لئے مناسب الفاظ کے استعمال سے بھی قاصر ہوں۔انکی رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہی نے میری مشکل آسان کی۔ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی صاحب،صدر شعبہ اردو،ایل۔ایس کالج مظفرپور نے بھی جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوا،نہایت انہماک کے ساتھ اپنی علمی، تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سے استفادے کے مواقع فراہم کئے۔میں انکاشکرگذار ہوں۔ساتھ ساتھ محترم المقام علی امام (معروف افسانہ نگار) اور رفیق انجم (شاگردعزیز شمس) صاحبان کا بھی سپاس گذار ہوں،جنکے مخلصانہ مشوروں نے بڑی تقویت پہنچائی ہے۔آخر میں میں مرشد و مربی عالی جناب حضرت شمس بمن گرامی کا تذکرہ ناگزیر تصور کرتا ہوں،جنہوں نے میری مشکلات کوحل کرنے میں بے حد خلوص کے ساتھ تعاون کیا ہےاور جنکے تعاون خاص کے بغیر میں اپنے اس منصوبے کومکمل نہیں کر سکتا تھا،ان کے بڑے صاحبزادے خورشید نیر اور منجھلے صاحبزادے ابوالفضل محمد ناصر کا بھی شکرگزار ہوں۔جنہوں نے موادمہیا کرنے میں میری مدد کی تھی۔ان کی صاحبزادیاں انجم،تسنیم،کوثر،پروین اور ناہید کا بھی شکرگزار ہوں۔میں ان کی شریک حیات میمونہ خاتون کی حوصلہ افزائی کا بھی ممنون ومشکور ہوں اورآخر میں جناب شمس کے صاحبزادے برادرِعزیز ڈاکٹر میجر شفیق فیضی کا سب سے زیادہ مشکور ہوں جنہوں نے طباعت کی ساری ذمہ داری اپنے سر لی اوراس کتاب کومنظرعام پرلاکراپنا حق ادا کیا۔

میں جناب فردالحسن کا بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے کمپوزنگ اور طباعت کی ساری منزل کوآسان بنادی۔

تمام قارئین کرام سے میری گذارش ہے کہ وہ کتاب پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات سے ہمیں ضرورنوازیں۔

ایم.اے. آزاد عالم

★★★

نام اور جائے پیدائش

شمس بمن گرامی کے والد محترم نے انکا نام ''احمد'' رکھا۔مدرسہ میں مولوی صاحب نے اپنی طرف سے ''حسین'' کا اضافہ کر دیا۔اس طرح ''احمد حسین'' ہو گئے۔جب یہ میٹرک کے طالب علم تھے۔تب شعر و شاعری سے بھی کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی اور بطور تخلص ''قمر'' لکھنے لگے مگر انکے اردو کے استاد جناب مولانا افضال حسین صاحب نے کہا کہ تمہارے نام کے دونوں اجزاء دو عظیم شخصیتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔اسلئے تخلص بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔سیاروں میں سب سے بڑا اور عظیم سیارہ جسے نیّر اعظم بھی کہتے ہیں وہ شمس ہے۔اسلئے ''قمر'' کی جگہ ''شمس'' تخلص کیا کرو۔اس وقت سے یہ ادبی دنیا میں شمسؔ کے تخلص ہی سے روشناس ہونے لگے۔ان کے والد محترم کہا کرتے تھے کہ ایک روز کسی واعظ نے سیرت پاک کے جلسہ میں کہا کہ جس کا نام ''احمد'' یا ''محمد'' ہوگا اُسے دوزخ کی آگ چھو بھی نہیں سکتی ایک مسلمان کا دل مچل گیا اور حضورؐ سے والہانہ عقیدت و محبت کی بنا پر انہوں نے اپنے بچے کا نام ''احمد'' رکھا۔

انکے گاؤں میں ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور ان میں بھی بنگالی کثیر تعداد میں تھے۔اس نوزائیدہ کو راجپوتوں، برہمنوں اور بنگالیوں نے پیار سے ''مادھو'' کہنا شروع کیا۔اس طرح انکا نام ہو گیا۔احمد حسین عرف مادھو المتخلص بہ شمسؔ۔

صوبہ بہار کا ضلع سنتھال پرگنہ (اب صوبہ جھارکھنڈ میں ہے) جو بنگال سے متصل ہے۔اس ضلع کے اتر میں دریائے گنگا کے بعد پورنیہ (اب کٹیہار) اور مالدہ ضلع ہیں۔دکھن اور پورب میں صوبہ بنگال اور پچھم میں بھاگلپور ضلع ہے۔اس ضلع کے شمالی مشرقی حصّہ میں راج محل تھانہ ہے۔شہر راج محل بالکل گنگا کے کنارے آباد ہے۔شاہ جہاں کے زمانہ میں یہ بنگال کا پایہ تخت تھا۔یہاں شاہ جہاں کا دوسرا بیٹا شاہ شجاع حکمرانی

کرتا تھا۔ اسی راج محل کے آٹھ نومیل جنوب میں ایک چھوٹی سی بستی ہے"بامون گرام"،جس کا ریلوے اسٹیشن تین پہاڑ ہے۔ جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور بامون گرام سے ایک میل مشرق ہے۔یہی بامون گرام شمس صاحب کی جائے پیدائش ہے۔اسی گاؤں میں جولائی ۱۹۲۱ء کی کسی تاریخ میں یہ پیدا ہوئے تھے (میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں نومبر کا مہینہ درج ہے)

بامون گرام کی وجہ تسمیہ

بقول شمس صاحب ایک روز ۵۸۔۱۸۵۷ء میں تین حضرات اتفاقاً ایک جگہ مل گئے۔تینوں اپنی اپنی اہلیہ کے ساتھ تھے۔ایک کا نام ہاشم علی تھا۔جو شاہ آباد (اب بھوجپور) سے آئے تھے،دوسرے پران رکشت تھے جو ذات کے حلوائی تھے اور ضلع بردوان (بنگال) سے آئے تھے،تیسرے تھے دیوی بھگت جو اپنے کو قنوجیہ تیلی کہتے تھے،مگر انکی زبان بھوجپوری تھی۔تینوں میں بڑی دوستی ہوگئی اور اسی جگہ ان تینوں نے کچھ الگ الگ ہٹ کر اپنی جھونپڑی کھڑی کر لی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد بردوان کے بہت سارے بنگالی آ کر اس جگہ بسنے لگے اور مغرب سے بھی لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔اس طرح قلیل عرصہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں اُبھر آیا۔مگر اب تک اس گاؤں کا کوئی نام نہیں پڑا تھا۔تین پہاڑ والے اسے"چمر ٹولی" کہہ کر پکارتے تھے،کیونکہ اس وقت تک تین چار چمار آ کر وہاں بس چکے تھے۔کچھ دنوں بعد ایک برہمن بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ آ کر اس گاؤں میں بس گئے۔پران رکشت دیوی بھگت اور ہاشم علی نے کہا کہ اب تک تو اس گاؤں میں کوئی اعلیٰ ذات کا آدمی نہیں آیا تھا،پھر اس گاؤں کا نام اسی برہمن کی مناسبت سے کیوں نہیں رکھ دیا جائے۔پران رکشت نے کہا کہ تا ہو لے آما دیر گرامیر نام تھا کیے"بامون گرام"اسی بامون گرام کو شمس صاحب نے بمن گرام

کردیا ہےاور شمس کے ساتھ اپنے کو بمن گرامی کہتے تھے۔

بمن گرام زندہ دلوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ جہاں آج بھی ہندو مسلم اتفاق واتحاد کا بول بالا ہے۔اس گاؤں میں اگر کوئی جائے تو وہ دیکھے گا کہ وہاں کا ہر آدمی ایک دوسرے کا رشتہ دار معلوم ہوتا ہے اور اپنے اپنے رشتوں کو ہر آدمی حتی المقدور نباہتا ہے۔

اس اتفاق واتحاد کے بارے میں شمس صاحب دلچسپ واقعہ سناتے تھے کہ جب یہ چھٹے درجے کے طالب علم تھے،انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ایسوٗ کا کا ''ہندو'' ہیں۔ یہ انہیں اپنا حقیقی چچا سمجھ رہے تھے۔ایک روز کچھ بنگالی لڑکوں اور انکے بھائی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ایک کی زبان سے نکلا کہ ''مسلمان سب بہت بدمعاش ہوتے ہیں،دوسرے نے کہا کہ بنگالی بھوت ہوتا ہے''۔اتفاق سے انکے والدِ محترم (جناب عبدالرحیم صاحب) وہاں پہنچ گئے اور دونوں کو دو دو چپت رسید کی۔اسی بیچ ایسوٗ کا کا بھی پہنچ گئے اور انکے والد صاحب سے کہا کہ بھیا ان لوگوں کے دماغ میں یہ زہر کہاں سے آ گیا؟ ہم ہندو ہیں مگر پھر بھی بھوجی (بھابی) ہم کو اپنا خاص دیور سمجھتی ہیں۔مگر یہ سب لڑکے تو بہت بے کہل (نا خلف) ہو گئے ہیں۔یہ بات شمس صاحب بھی سُن رہے تھے۔یہ دوڑے دوڑے ماں کے پاس آئے اور پوچھا کہ ماں! کیا ایسوٗ کا کا ہندو ہیں؟ مگر بجائے اسکے کہ وہ کوئی جواب دیتیں انہوں نے انہیں ڈانٹ کر چپ کر دیا۔اس واقعہ کو شمس صاحب برابر یاد کرتے تھے۔

یہ گاؤں سڑک کی دونوں جانب بسا ہوا ہے۔مگر اکثریت بنگالیوں کی ہے۔آج کل بہت سے نئے نئے لوگوں کے مکانات بن گئے ہیں۔تعلیم کے لحاظ سے بھی یہ گاؤں کافی ترقی کر رہا ہے۔مگر حیرت اس بات پر ہے کہ شمس صاحب بنگالیوں کے درمیان رہتے ہوئے بنگلہ لکھنا پڑھنا تو جانتے تھے مگر بنگلہ بولنا نہیں جانتے تھے۔

★★★

شجرہ

شمس کے دادا کہ مطابق مورث اعلیٰ کے جو نام ہیں وہ یہ ہیں۔

شمس کے دادا کے بڑے بھائی پیر علی صاحب آرہ سے انکے دادا ہاشم علی صاحب
کے آنے کے بہت دنوں بعد راج محل کے علاقہ تین پہاڑ گاؤں میں آئے اور کپڑے کی

تجارت کرنے لگے اور کچھ دنوں بعد کافی زمین جائیداد حاصل کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس علاقہ کے بہت بڑے مہاجن ہو گئے اور رئیسانہ ٹھاٹ سے رہنے لگے۔ ہاشم علی پیر علی کے بڑے لڑکے عبدالرحمٰن صاحب کو بہت پیار کرتے تھے۔ شمس دادا سے ہر روز بلا ناغہ ہاموں گرام سے تین پہاڑ۔ سہ پہر کو اپنے بھیا سے ملنے جایا کرتے تھے اور گھنٹوں دونوں بھائی نہ جانے کیا کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ پیر علی صاحب ایک مشرع زندگی گذارتے تھے اور ہاشم علی تاڑی پیا کرتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں ہاشم علی صاحب پھلواری شریف کے ایک پیر کے مرید ہو گئے تھے اور تاڑی پینی چھوڑ دی تھی، مگر پھر بھی کبھی شکایت مل ہی جاتی تھی۔

اس سلسلے کی ایک دلچسپ کہانی شمس نے سنائی۔ ایک دن ان کے دادا جان منگل ہاٹ سے گھوڑے پر سوار ہو کر شام کو گھر کی جانب چلے تو ریلوے پل کے نیچے شمسان گھاٹ پر جیسے ہی پہنچے تو ایک ناٹے قد کے سیاہ فام آدمی نے انہیں روکا اور ان سے کھینی کی طلب کی انہوں نے گھوڑے کو روکا اور جیب سے کھینی نکال کر اس کی جانب حاضر کیا۔ اس سیاہ فام نے ان کی کلائی تھام لی اور ایک جھٹکے سے انہیں زمین پر گرادیا۔ مگر وہ دامن جھاڑ کر اٹھے اور سیاہ فام سے لپٹ گئے۔ دونوں میں رات بھر کشتی ہوتی رہی۔ شمسان گھاٹ کے سارے بھوت اس تماشہ کو دیکھنے کو جمع ہو گئے۔ مگر ایک دفعہ انہوں نے یا علی کہہ کر جو ہاتھ مارا تو سیاہ فام چاروں شانے چیت ہو گیا۔ اور سارے بھوت بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر گھر کی جانب چل پڑے۔ انہوں نے اپنا کپڑا دکھایا جو جگہ جگہ سے تار تار اور گرد آلود تھا۔ اس کہانی پر بوڑھے بچے سبھی کو یقین آ گیا۔ مگر شمس کی دوسری والدہ کو بالکل یقین نہیں آیا۔ انہوں نے کہا کہ بابا گڑھ کر کہانی سنا رہے ہیں۔ شمس کے والد سے کہا ان کا منہ سونگھئے۔ اس دن سے ان پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ تین پہاڑ اپنے بھائی سے ملنے جا سکتے ہیں۔

پیر علی اپنے چھوٹے بھائی ہاشم علی کو بہت پیار کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً انکی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔

آبائی وطن

ضلع آرہ کا شہر جگدیش پور محتاج تعارف نہیں۔ یہاں راجہ کنور سنگھ بڑی آن بان سے راج کرر ہے تھے۔ ہر دلعزیز اتنے تھے کہ ان کی سلطنت کا ایک ایک فرد خواہ ہندو ہو یا مسلمان ان پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار رہتا تھا اور ہر روز صبح وشام ان کا گُن گان کیا کرتا تھا۔ ان کی عزت دلوں میں اتنی تھی کہ لوگ بڑی بھکتی سے ان کا نام لیا کرتے تھے اور راجہ کنور سنگھ نہیں بلکہ بابو کنور سنگھ کہہ کر پکارتے تھے۔ جگدیش پور کے نزدیک ہی ایک گاؤں ہے باگھا کول تتیا۔ یہیں شمس صاحب کے مورث اعلیٰ رہا کرتے تھے۔ انکے پردادا شوبھا میاں اپنے آبائی پیشے میں بہت ہی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انکے بڑے لڑکے پیر علی کو تجارت سے دلچسپی تھی اور وہ اپنی جوانی میں کپڑوں کی تجارت کرنے لگے تھے۔ مگر ہاشم علی کو نہ تو اپنے پیسے سے دلچسپی تھی اور نہ ہی تجارت سے۔ سولہ سترہ سال کی عمر تک یہ کشتی کے اکھاڑوں میں اپنا کرتب دکھاتے رہے اور لا اُبالی پن کے ساتھ زندگی گذارتے رہے۔ ہاں ڈانٹ ڈپٹ پر کسی قدر انہوں نے پڑھ لکھ بھی لیا۔ اور شام کے وقت چوپال میں بیٹھ کر کنور وجنی گاتے اور سامعین کو ہندوستانیوں کی بہادری کی داستان سُنا سُنا کر بہادر بنانے کی کوشش کرتے۔ اتنی بات ضرور تھی کہ کبیر اور رحیم کے بہت سے دوہے اور گردھر کی کنڈلیاں لوگوں سے سُن سنا کر زبانی یاد کر لی تھی۔ لاٹھی چلانے اور شمشیر زنی میں انہیں کافی مہارت تھی۔ انکے اس جوش و رجحان کو دیکھ کر انکے والد شوبھا میاں انکے سسر، جو گوشائیں جی کہلاتے تھے کہ توسل سے بابو کنور سنگھ کے یہاں سپاہی میں انکی بھرتی کرادی۔ اس وقت صرف انکی منگنی ہوئی تھی۔ دو سال بعد یعنی بیس سال کی عمر میں ان کا نکاح کر دیا گیا۔ دو تین سال کے قلیل عرصہ میں یہ باضابطہ طور پر بابو صاحب کی فوج میں لے لئے گئے اور انکا گونا یعنی رخصتی بھی ہوگئی یہ وہ زمانہ تھا جب سارے ہندوستان

میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ سلگ رہی تھی۔ راجے رجواڑے، نواب، زمیندار سب سر جوڑ کر یہ سوچ رہے تھے کہ کس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔ خفیہ طور پر انکے اور تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر کے درمیان رابطہ قائم تھا۔ آخر تمام ہندوستانیوں نے بہادر شاہ ظفر کی سرکردگی میں انگریزوں سے لوہا لینے کی قسم کھائی۔ اس کام میں بابو کنور سنگھ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ ۱۸۵۶ء کی بات ہے۔

ہاشم علی فوجی تربیت لینے لگے اور اپنے بٹالین میں ایک خاص مقام حاصل کرلیا۔ وہ شمشیر زنی میں لاجواب تھے اور بندوق کا نشانہ بھی اچوک تھا۔ جب ۱۸۵۷ء میں جنگ کا بگل بجا تب یہ اس آگ میں بے دھڑک کود گئے۔ مگر ہندوستانیوں کی قسمت میں شکست لکھی تھی۔ کنور سنگھ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے گنگا میں کود پڑے۔ انگریزوں کی ایک گولی انکے بائیں بازو میں لگی۔ شمس صاحب کی دادی کہتی تھیں کہ کنور سنگھ نے تلوار نکال کر اس زخمی بازو کو کاٹ دیا اور کہا "اے گنگا میا! یہ بازو تیری نذر ہے"۔ اسکے بعد انکا سراغ نہیں ملا۔ انکے چھوٹے بھائی امر سنگھ کو گرفتار کر کے بیچ بازار میں پھانسی دیدی گئی۔ شمس صاحب کی دادی کہتی ہیں کہ "میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پھانسی کا جلاّ د رسّی کھینچتے وقت کہہ رہا تھا کہ بھائی لوگ ہمارا کسور نہیں کو ئمنی بہادر کا حکم ہے"۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے مظالم ہندوستانی عوام پر انتہائی عروج پر پہنچنے لگے۔ سارا شمالی ہند انگریزوں کے ظلم و تشدد سے چیخ اُٹھا۔ ہر گھر سے آہ وفغاں کی آواز بلند ہونے لگی۔ اسی افراتفری میں اپنی منکوحہ بیوی اور گود کی بچی (پاروتی) کے ساتھ کچھ زادِراہ اور ایک تلوار (سیف) لے کر راتوں رات گھر سے بھاگ نکلے اور چھپتے چھپاتے یہ سنتھال پرگنہ (اب صاحب گنج) کے جنگلستان میں آگئے اور ایک چھوٹے سے گاؤں جسمیں بدقت تمام چار پانچ گھر چماروں کے تھے، اسی گاؤں کی سڑک پر اتفاقاً دوا اور نوواردوں سے ملاقات ہوگئی اور یہ تینوں حضرات اسی جگہ اب سڑک شمالی جانب کچھ ہٹ ہٹ کر اپنے اپنے گھر بنا کر رہنے لگے۔

ہاشم علی صاحب پہلے تو ہاٹ بازار جا کر نمک بیچا کرتے تھے۔ پھر بعد میں مقامی بنکروں سے کپڑا خرید کر ہاٹ بازار میں بیچنے لگے اور رفتہ رفتہ مل کے کپڑوں کی بھی ایک اچھی خاصی دکان ہوگئی۔

۱۸۶۲ء میں ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کی ملکہ معظمہ بن گئیں۔ اس سال یعنی ۱۸۶۲ء سے ہاشم علی کو انگریزوں سے اتنی نفرت ہوگئی کہ جس سکہ پر ۱۸۶۲ء نقش ہوتا تھا، وہ اسے چھونا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے اور یہی حال شمس صاحب کے والد عبدالرحیم صاحب کا بھی ہوا۔

جس جگہ ان تینوں نے اپنا اپنا ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ اس جگہ بعد میں بہت سے لوگ آتے گئے اور ایک بستی بس گئی۔ جسکا نام ان تینوں نو واردوں نے اپنے ایک برہمن دوست کے اعزاز میں "باموں گرام" رکھ دیا اور سب حقیقی بھائی کی مانند آپس میں مل جُل کر رہنے لگے۔ جس کا اثر آج بھی وہاں دیکھا جا سکتا ہے اور جس کی جھلکیاں شمس صاحب کے کلام، انکی تخلیقات اور کتابوں میں جا بجا ملتی ہیں۔

اسی گاؤں میں ہاشم علی کی بقیہ بھی اولادیں پیدا ہوئیں۔ یہ لاابالی قسم کے انسان تھے کمانا جانتے تھے مگر جمانا نہیں۔ جو کچھ کماتے تھے بال بچوں کی پرورش و پرداخت پر خرچ کیا اور جو بچا انکی تاڑی پی لی۔ دوسری طرف انکے بڑے بھائی پیر علی صاحب تین پہاڑ آ چکے تھے، دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے تھے اور کافی جائیداد کے مالک بن گئے تھے۔

شمس صاحب کے دو چچا یعنی امانت اللہ صاحب اور علی جان صاحب کچھ پڑھ نہیں سکے۔ مگر تجارت میں ان دونوں نے کافی ترقی کی۔ انکے سب سے چھوٹے چچا میاں جان صاحب کافی تعلیم یافتہ تھے اور اپنی سسرال تین پہاڑ میں بس گئے تھے۔ یہیں وہ لور پرائمری اسکول میں اردو مدرس کی حیثیت سے بحال تھے۔

جناب عبدالرحیم نے اردو، عربی کی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے گاؤں کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ ہاشم علی نے انہیں کپڑے کی دکان پر بیٹھا دیا اور یہ ہاٹ بازار جا جا

کر مل والا کپڑا بیچا کرتے تھے۔ شمس صاحب بھی کبھی کبھی اپنے والد کے ساتھ کپڑے لانے بر ہروا جایا کرتے تھے اور بعد میں چھٹی کے دن انکے والد انہیں ہی کپڑا لانے بر ہروا نتھ مل مارواڑی کے یہاں بھیجنے لگے۔

عبدالرحیم صاحب اور علی جان صاحب کی شادی بھاگلپور ضلع میں ہوئی۔انکی سسرال والے بلیا کے رہنے والے تھے جو بھاگلپور ضلع کے بار ہاٹ نامی گاؤں میں بس گئے تھے۔ان دونوں بھائیوں کی شادیاں ایک ہی گھر میں دو بہنوں سے ہوئی تھیں۔انکے سسر کا نام داتا بخش تھا۔جو اپنی اہلیہ کے ساتھ باراہاٹ میں بس گئے تھے۔انکے دولڑکے اور چارلڑکیاں تھیں۔لڑکیاں،محبوبہ خاتون عیدیہ،شہیدہ اور زینت تھیں اورلڑکوں کے عرفی نام جمن میاں اور گمن میاں تھے۔گمن میاں کا نام نظام الدین اور جمن میاں کا نام شمس صاحب کو بھی یاد نہیں تھا۔

محبوبہ خاتون سے عبدالرحیم کی اور عیدیہ سے علی جان کی شادی ہوئی تھی۔اسی محبوبہ خاتون کی بطن سے شمس صاحب پیدا ہوئے تھے۔محبوبہ خاتون بڑی نیک اور پارسا عورت تھیں۔انکا زیادہ وقت نماز،وظیفہ،ذکر،ورداورقرآن شریف کی تلاوت میں گذرتا تھا۔فرصت کے اوقات میں بچوں کے کپڑے ہاتھ سے سیا کرتی تھیں اور خانہ داری کا انتظام چھوٹی بہن عیدیہ کے ذمہ تھا۔دونوں بہنوں میں بے انتہا محبت تھی۔

محبوبہ خاتون کی حیات تک اس گھر میں امن وشانتی کا راج رہا۔دونوں بھائی مل جل کر کام کرتے اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف دھیان دیتے رہے مگر انکی وفات کے بعد ہی علی میاں اور انکی بیگم کے رویے میں تبدیلی محسوس کی جانے لگی۔یہ دونوں ملکر مشترکہ اندوختہ ازقسم زیورات،ظروف ونقدی وغیرہ جوایک صندوق میں بند تھا نکال نکال کر اپنے کمرے میں جمع کرنے لگے۔عبدالرحیم اس سے قطعی لاعلم تھے۔انکے بڑے لڑکے عبدالرزاق صاحب گنج ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور وہیں ہوسٹل میں رہتے تھے۔لڑکی اپنی سسرال میں رہتی تھی۔دوسرے لڑکے عبدالمنان صرف پانچ سال

کے تھے، شمس کی عمر بہ دقّت ڈھائی سال کی تھی اور چھوٹا لڑکا مصطفےٰ آٹھ نو ماہ کا معصوم بچہ تھا۔ وہ اپنے چچا اور چچی کی حرکتوں سے غافل تھے ایک نئی دُلہن یعنی عبدالرزاق کی بیوی تھیں، جو یہ سب حرکتیں دیکھ رہی تھیں، مگر زبان بند تھی۔

محبوبہ خاتون کی رحلت کے کچھ دنوں بعد علی جان میاں نے عبدالرحیم کی شادی بمن گرام سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ''بوریو'' نام کے ایک گاؤں میں کرادی۔ یہ لوگ مقامی تھے اور عقیدۃً غیر مقلد تھے۔ اس عقیدہ کا اثر اس گھر پر بھی پڑا اور شمس صاحب کے دل و دماغ پر اسکا اثر تادم حیات رہا۔

شادی کے چند دنوں بعد سے ہی دونوں بھائیوں میں کھٹ پٹ ہونے لگی۔ اور ایک دن دونوں علیحدہ ہو گئے۔ آنگن کے بیچوں بیچ ایک دیوار کھڑی کردی گئی۔ صندوق جسکی چابی علی جان صاحب کی بیگم کے پاس تھی، کھولا گیا تو صرف ایک پیتل کی گگری نکلی۔ عبدالرحیم سکتے میں آ گئے۔ انہوں نے علی جان کو صرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور خاموش رہ گئے۔ گگری بیچ کر روپے دونوں بھائیوں نے تقسیم کر لئے۔ یعنی علیحدگی کے وقت عبدالرحیم کے پاس گنتی کے چند روپے تھے۔

بٹوارے میں بھائیوں کے درمیان والدین کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ یعنی ہاشم علی صاحب علی جان کے حصہ میں آئے، اور ماں عبدالرحیم صاحب کے حصہ میں۔ ایک بات بتادوں کہ جب محبوبہ خاتون کا انتقال ہوا، تب مصطفےٰ صرف نو ماہ کا تھا۔ شمس کی دادی جو بالکل ضعیف ہو چکی تھیں، انہوں نے اپنا دودھ مصطفےٰ صاحب کو پلایا وہ کہتی تھیں کہ ادھر اسکی ماں فوت ہوئیں۔ ادھر ہم نے محسوس کیا کہ میری چھاتیوں میں دودھ بھر آیا ہے۔

عبدالرحیم نے بہو کے زیورات رہن رکھ کر کچھ قرض لئے اور کپڑے لاکر ہاٹ بازار میں بیچنے لگے۔ انکی دوسری بیگم نے کبھی بچوں کو ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ خصوصاً عبدالرزاق کو جو صاحب گنج روپے بھیجتے رہے۔ گاؤں کے غریب آدمی ہونے کے باوجود انکی عزت و وقار میں کمی نہیں آئی۔ دوسری طرف علی جان دن دونی

رات چوگنی ترقی کرنے لگے اور بہت جلد اپنے مکان کو انہوں نے جدید طرز پر کھڑا کر لیا اور ان کے بال بچے امیرانہ ٹھاٹ کی زندگی گذارنے لگے۔

شمس کے ماموں جان گمن میاں نے اگر چہ اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔مگر انہیں مطالعہ کا شوق تھا۔وہ ایک کامیاب تاجر تھے۔۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا ہندوستان سیاسی میدان کے علاوہ مذہبی مناظرہ کا بھی اکھاڑہ بن گیا تھا۔تحریک خلافت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا تھا۔جس سے سرکار انگلیشیہ کا تخت لرزنے لگا تھا۔آخر انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔اس وقت آریہ سماج بری طرح منظم ہو رہا تھا۔مگر اسکی ساری کارگذاریاں ہندوؤں تک محدود تھیں۔انگریزوں نے اپنی چال سے آریوں اور مسلمانوں کو مناظروں میں الجھا دیا۔نتیجتاً جا بجا ہندو مسلمان فسادات ہونے لگے ادھر پادری بھی مسلمانوں سے مناظرہ پر کمربستہ ہو گئے۔

ایک دن اس علاقہ میں اشتہار تقسیم کیا گیا کہ بھاگلپور میں ایک زبردست مناظرہ آریوں اور مسلمانوں میں ہونے والا ہے۔جسمیں بڑے بڑے علماء اور آریہ پنڈتوں کے نام چھپے تھے۔نظام الدین عرف گمن میاں بھی اس مناظرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔اسکی ضرورت انہیں اسلئے پیش آئی کہ انکے گاؤں میں بہت سے ہندو آریہ سماج میں داخل ہو گئے تھے اور اکثر و بیشتر انہیں چھیڑتے رہتے تھے۔پادری صاحبان بھی گمن میاں سے ملاقات ہونے پر اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور یہ بیچارے کسی کا جواب نہ دے سکتے تھے۔

شمس صاحب کہتے تھے کہ اس مناظرہ کی روداد خود گمن میاں کی زبانی اور بھاگلپور کے کچھ پرانے لوگوں کی زبانی انہوں نے سنی ہے۔

محمود دھرم پال ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے۔مگر مرتد ہو کر آریہ سماج میں داخل ہو گئے۔انہوں نے بی۔اے۔کی ڈگری لی ہوئی تھی۔یہ گھوم گھوم کر مسلمان عالموں سے مناظرہ کرنے لگے۔انہوں نے ایک بار کھڑے ہو کر پنڈال کے علماء کو ہی نہیں بلکہ ہندوستان

کے سارے مسلمانوں کو چیلنج کرتے ہوئے ایک نہایت پیچیدہ سوال کر دیا۔

محمود دھرم پال نے کہا کہ مسلمان چرند و پرند بسم اللہ اللہ اکبر تین بار پڑھ کر ذبح کرتے ہیں تو وہ حلال ہوتا ہے۔تو کیا کسی بھی چرند و پرند کو یہ کلمات پڑھ کر ذبح کرنے سے حلال ہوگا؟یا کچھ چرند و پرند حلال نہیں ہوگا؟اگر ایسا نہیں ہوگا تو یہ کلمہ کیوں پڑھے؟اگر یہ کلمہ پڑھ کر ذبح کرنا حلال کرتا ہے تو کس بھی چرند و پرند کو حلال ہونا چاہئے؟ آپ لوگ اسکا جواب دیں کہ کچھ جاندار پہلے سے حلال ہیں یا متذکرہ کلمات پڑھ کر اس کو حلال کیا جاتا ہے؟ سوال سن کر سارے پنڈال میں سکوت چھا گیا۔

محمود دھرم پال کے ساتھ انکی دھرم پتنی بھی اسٹیج پر موجود تھیں۔اچانک کمن میاں اُٹھے اور انہوں نے دھرم پال سے پوچھا کہ آپکے بغل میں کون عورت بیٹھی ہوئی ہے؟دھرم پال نے جواب دیا میری پتنی ہیں۔کمن میاں نے پوچھا آپ نے باقاعدہ اشلوک اُچارن کے دوران آگ کے پھیرے لگا کر انہیں اپنی پتنی بنایا ہے؟یا ویسے ہی کہیں سے اٹھالائے ہیں۔دھرم پال بولے،اشلوک،پوجا اور آگ کے گرد پھیرے کے بعد باقاعدہ اس سے شادی کر کے پتنی بنایا ہے۔کمن میاں بول اُٹھے اگر اشلوک پوجا اور آگ کے گرد پھیرے سے کوئی عورت آپکی پتنی بن سکتی ہے تو آپکی ماں یا بہن بھی آپکے ساتھ ایسا کر کے آپکی پتنی بن سکتی ہے؟اگر نہیں تو کیوں؟ کیا کچھ رشتے پہلے سے اسکے لئے حرام قرار دئے گئے ہیں؟اگر ہاں تو پھر شادی کے لئے اشلوک،پوجا اور آگ کے گرد پھیرے کی کیا ضرورت واہمیت رہ جاتی ہے؟ سارے پنڈال کو جیسے سکتہ ہوگیا۔

کمن میاں نے کہا،آپکے سوال کا جواب تو علماء دینگے۔مگر میرے سوال کا جو جواب آپ دینگے وہی جواب میری طرف سے آپکے سوال کا جواب ہوگا۔سارا پنڈال نعرۂ تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا۔زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے اور لوگوں نے کمن میاں کو کاندھوں پر اٹھالیا۔

کے سارے مسلمانوں کو چیلنج کرتے ہوئے ایک نہایت پیچیدہ سوال کر دیا۔

محمود دھرم پال نے کہا کہ مسلمان چرند و پرند بسم اللہ اللہ اکبر تین بار پڑھ کر ذبح کرتے ہیں تو وہ حلال ہوتا ہے۔تو کیا کسی بھی چرند و پرند کو یہ کلمات پڑھ کر ذبح کرنے سے حلال ہوگا؟یا کچھ چرند و پرند حلال نہیں ہوگا؟اگر ایسا نہیں ہوگا تو یہ کلمہ کیوں پڑھے؟اگر یہ کلمہ پڑھ کر ذبح کرنا حلال کرتا ہے تو کس بھی چرند و پرند کو حلال ہونا چاہئے؟ آپ لوگ اسکا جواب دیں کہ کچھ جاندار پہلے سے حلال ہیں یا متذکرہ کلمات پڑھ کر اس کو حلال کیا جاتا ہے؟ سوال سن کر سارے پنڈال میں سکوت چھا گیا۔

محمود دھرم پال کے ساتھ انکی دھرم پتنی بھی اسٹیج پر موجود تھیں۔اچانک گمن میاں اُٹھے اور انہوں نے دھرم پال سے پوچھا کہ آپکے بغل میں کون عورت بیٹھی ہوئی ہے؟دھرم پال نے جواب دیا میری پتنی ہیں۔گمن میاں نے پوچھا آپ نے باقاعدہ اشلوک اُچارن کے دوران آگ کے پھیرے لگا کر انہیں اپنی پتنی بنایا ہے؟یا ویسے ہی کہیں سے اُٹھالائے ہیں۔دھرم پال بولے،اشلوک،پوجا اور آگ کے گرد پھیرے کے بعد باقاعدہ اس سے شادی کر کے پتنی بنایا ہے۔گمن میاں بول اُٹھے اگر اشلوک پوجا اور آگ کے گرد پھیرے سے کوئی عورت آپکی پتنی بن سکتی ہے تو آپکی ماں یا بہن بھی آپکے ساتھ ایسا کرکے آپکی پتنی بن سکتی ہے؟اگر نہیں تو کیوں؟ کیا کچھ رشتے پہلے سے اسکے لئے حرام قرار دئے گئے ہیں؟اگر ہاں تو پھر شادی کے لئے اشلوک،پوجا اور آگ کے گرد پھیرے کی کیا ضرورت واہمیت رہ جاتی ہے؟ سارے پنڈال کو جیسے سکتہ ہوگیا۔

گمن میاں نے کہا،آپکے سوال کا جواب تو علماء دینگے۔مگر میرے سوال کا جو جواب آپ دینگے وہی جواب میری طرف سے آپکے سوال کا جواب ہوگا۔سارا پنڈال نعرۂ تکبیر کی آواز سے گونج اُٹھا۔زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے اور لوگوں نے گمن میاں کو کاندھوں پر اُٹھالیا۔

وہاں سے آ کر گمن میاں نے مذہبی کتابوں کا تنقیدی مطالعہ شروع کر دیا۔ آریوں اور عیسائیوں کی بہت سی کتابیں جو اردو میں چھپی منگوائیں اور انکے مطالعہ سے وہ ایک بہت بڑے مناظرہ باز بن گئے۔ دو تین سال بعد اخبار پیسہ میں اعلان ہوا کہ محمود دھرم پال پھر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اب انہیں مسلمان غازی محمود دھرم پال کہنے لگے۔

گمن میاں کے مناظروں سے متعلق بہت سی کہانیاں اس علاقہ میں آج بھی زبان زد عام ہیں۔ یہ اتنے بڑے مناظر ہوئے کہ وہاں پادری اور پنڈت جو انہیں چھیڑا کرتے تھے اب انہیں دیکھ کر بغلیں جھانکنے لگے۔ بڑے بڑے پنڈت اور پادری انکے سامنے آنے سے گھبراتے تھے۔ باراباٹ کے آریوں نے ان سے مناظرہ کرانے کے لئے بنارس اور الہٰ بادتک کے پنڈتوں کو بلایا۔ مگر اللہ کی مہربانی کہ ہر معرکہ میں گمن میاں کامیاب رہے۔ خدا نے انہیں یادداشت اتنی اچھی دی تھی کہ جس کتب کو وہ ایک مرتبہ پڑھ لیتے، پھر اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قرآن اور انجیل کی آیتیں، گیتا اور وید کے اشلوک انکی نوک زبان پر رہتے تھے۔ مناظرہ کے وقت، کتاب کا حوالہ، صفحہ نمبر اور ہر اشلوک کا باب اور نمبر فوراً دیتے جاتے تھے۔ گمن میاں یوں تو حنفی العقائد تھے مگر بعد میں سخت قسم کے غیر مقلد ہو گئے تھے۔

شمس صاحب نے بچپن میں ان سے بھی اردو پڑھا تھا۔ اسکول کے زمانہ میں جب یہ باراباٹ جاتے تو اپنے ماموں جان کی الماری سے کتابیں نکال کر پڑھتے اور بہت سی باتوں میں ان سے تبادلۂ خیال کرتے۔ ۱۹۴۲ء میں ماموں جان کی کوشش سے انکی شادی اپنی خالہ زاد بہن سے ہوئی۔ گمن میاں کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ مگر افسوس یہ اپنے اس محسن کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمس صاحب کے دماغ میں مذہبی رجحان پیدا کرنے اور مذاہب کا نقاد بنانے میں انکی باتوں اور صحبتوں کا ہاتھ تھا۔

★★★

بچپن کے حالات

جاں بازی شمس کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ جب وہ تیسری جماعت میں تھے تو ایک دن پُل پر کتاب کا بستہ رکھ کر اسٹیشن کی جانب چل پڑے اور ٹرین پر جا بیٹھے۔ پاکٹ میں صرف چھ پیسے تھے۔ عظیم گنج میں گاڑی رُکی۔ مسافر اترے، وہ مسافر کے پیچھے پیچھے چل پڑے مسافر کشتی پر چڑھنے لگے وہ بھی کشتی پر سوار ہو گئے۔ مرشد آباد پہنچ گئے ایک کوچوان نے ان کی مدد کی وہ کوچوان کے گھر پر رہنے لگے اس کے ساتھ کوچوانی کرنے لگے۔ تقریباً سارے کوچوان مسلمان تھے یہ لوگ ایک خاص لب ولہجہ میں اردو بولتے تھے۔ اسٹیشن میں یہ لوگ بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرتے اور آپس میں خوش گپیاں کرتے اور شمس ان لوگوں کو قوالی سناتے۔ انہیں ایک ہی قوالی یاد تھی۔

''محمدؐ کی اللہ والی کملیا۔ جہاں جی میں آئی بچھالی کملیا''

بچے کی زبان سے قوالی سن کر سب کوچوان جھوم اُٹھتے تھے۔ وہاں رہتے ہوئے شمس نے دو پیسہ کمانے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ کچھ حرفت سے دیا سلائی کی ڈبیا بیچ کر کمانے لگے۔ چار پانچ ماہ کے بعد ایک روز وہ چُپ چاپ وہاں سے نکل پڑے اور عظیم گنج اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹرین پر سوار ہو کر چترا پہنچ گئے۔ شہر کی جانب آگے بڑھے تو ایک عمارت بن رہی تھی جہاں ان کے ہم عمر بچے اینٹ ڈھور ہے تھے۔ مالک سے مل کر وہ بھی اس کام میں لگ گئے۔ اور تھوڑے ہی دیر میں ان ننھے ساتھیوں سے بل مل گئے۔ شام میں مزدوری کے عوض چار پیسے ملے۔ مگر اس انجان شہر میں جہاں ہر چہرہ اجنبی تھا اب مسئلہ تھا کہ رات کہاں گزاریں۔ گھومتے گھومتے ایک طرف نکل پڑے اور ایک ہاٹ میں پہنچ گئے۔ جہاں دکانداروں نے چھوٹی چھوٹی جھوپڑیاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ کچھ جھوپڑی میں اپنا بوریہ بستر لگا کر سوئے ہوئے تھے شمس نے بھی ایک جھوپڑی میں اپنا گمچھا بچھالیا اور سو

گئے۔اس طرح ہفتوں وہ دن میں اینٹ ڈھوتے اور رات میں جھونپڑی میں آرام کرتے۔ایک دن وہ شدید بخار میں مبتلا ہو گئے اور سر کی تکلیف سے کراہنے لگے۔دوسری جھونپڑیوں میں عموما بھیک مانگنے والے لوگ رہتے تھے ان کی آواز سن کر وہ لوگ شمس کے پاس آئے اور ان کی تیمارداری شروع کی۔ایک بھکاری نے بازار سے چرایتا خرید کر لایا اور اسے پانی میں بھگو دیا گیا اور دوسری صبح مریض کو پلایا گیا۔دوا بہت تلخ تھی مگر سر کی ڈلی اپنا رنگ دکھاتی۔تین روز تک بخار میں پڑے رہے۔بھکاری لوگ سابودانہ بنا کر انہیں پلاتے رہے۔وہاں کوئی کسی کا رشتہ دار نہ تھا مگر شمس کو ایسا معلوم پڑتا تھا کہ سبھی ایک ہی کنبے کے افراد ہیں۔لوگ روز لڑائیاں بھی کرتے تھے مگر پھر آپس میں مل جاتے تھے۔بیماری کے بعد کمزوری نے پکڑ لیا۔اندوختہ پیسے سے پیٹ پالتے رہے۔ایک دن شمس نے دیکھا کہ کچھ لڑکے لڑکیاں ٹوکری لے کر اسٹیشن کی جانب جا رہے ہیں۔پھر ریلوے پٹری کی طرف بڑھتے ہوئے سگنل کے پاس پہنچ گئے۔وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو لئے۔وہاں ایک انجن آ کر رکا۔سبھی نے ایک ایک اندا فائر مین کو دیا اور فائر مین نے سبھی کی ٹوکریوں کو کوئلے کے چور سے بھر دیا۔اور پھر ان لوگوں نے لوہاروں سناروں کے یہاں چار پیسے فی ٹوکری کے حساب سے بیچ دیے۔دوسرے دن سے شمس بھی اسی کام میں جٹ گئے۔ایک روز ایک بھونے والے کی دکان پر بیٹھ کر بھنا لے کر کھا رہے تھے تبھی ایک آدمی ان کے پاس آیا اور کہا ارے مادھو تو یہاں بھونا کھا رہا ہے اور تمہارے گھر پر رونا پیٹنا مچا ہوا ہے۔چل میرے ساتھ گھر چل شمس نکل بھاگنا چاہتے تھے مگر راز افشاں ہو گیا کہ یہ سات ماہ سے گھر سے غائب ہیں اور گھر کے سب لوگ پریشان ہیں۔عبدل میاں شمس کو لیکر رحمۃ اللہ میاں کے یہاں پہنچے رحمۃ اللہ میاں نے حالات کا جائزہ لیا اور ایک نیا کرتا پجامہ سلوا کر انہیں پہنایا۔دو تین روز کے بعد

روتی رہیں، پھر کھانا کھلایا اور اپنے ساتھ لیکر سور ہیں اور وعدہ لیتی رہیں کہ اب پھر گھر سے نہیں بھاگو گے ۔ میں نے کبھی تم پر ظلم نہیں کیا مگر سبھی تمہارے بھاگ جانے پر یہی کہتے تھے کہ سوتیلی ماں کے ظلم سے شمس گھر چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اب کبھی ایسا نہیں کروگے۔ شمس نے ماں کو تسلی دی۔ دوسرے صبح بھیا نے ڈانٹ سنائی مگر گرو جی نے انہیں خوب سمجھایا کہا کہ ابھی پڑھنے لکھنے کا وقت ہے پڑھ لکھ کر آدمی بن جاؤ تو دنیا کی سیر کرنا۔ تمہیں اسکالرشپ کا امتحان دینا ہے۔ اور تم یوں وقت برباد کرر ہے ہو۔ پھر شمس جی لگا کر پڑھائی میں جُٹ گئے۔

شمس کے بچپن کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ شمس نے ایک دن اپنی دادی سے دریافت کیا کہ دادی آسمان اتنا دور کیوں ہے؟ دادی نے از راہ مذاق فرمایا کہ ایک بڑھیا اپنے موسل سے دھان کوٹ رہی تھی بار بار اس کا موسل آسمان سے ٹکرا جاتا تھا۔ تبھی اس نے اپنی موسل سے آسمان کو اوپر کی جانب اپنی پوری طاقت سے ڈھکیل دیا اور آسمان دور بہت دور چھیکا گیا۔ وہ بوڑھیا کہاں رہتی ہے؟ دادی نے کہا جنگل میں۔ شمس نے اپنے ہمجولیوں کے ساتھ جنگل میں بڑھیا کو ڈھونڈھ نکالنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا مگر اس دوران دماغ میں بات آئی کہ بڑھیا کو چھوڑ کر کیوں نہیں آسمان پر چڑھا جائے۔ سنا ہے آسمان پر اللہ میاں کا باغ ہے۔ آم، امرود خوب ہوتا ہے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کیسے ہوگا۔ شمس نے کہا وہ دیکھو سامنے پہاڑ ہے نا اس پر سیڑھی لگا کر آسمان پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اب سیڑھی کی کھوج شروع ہوئی۔ پتا چلا سنگھ جی کہ یہاں سیڑھی ہے۔ سارے ساتھی سنگھ جی کے یہاں پہنچ گئے اور سیڑھی کی مانگ کی۔ سنگھ جی نے بچوں سے سوال وجواب کرنا شروع کیا تب ان پر یہ راز افشاں ہوا کے مادھو اور اس کے ساتھیوں کا ارادہ بلند ہے۔ انہوں نے خدشہ کوٹال دیا تقریباً چار پانچ روز تک ٹالتے رہے۔ پھر ایک دن سنگھ جی نے گرو جی کو اشارہ کر دیا۔ گرو جی نے مادھو اور شیونند کی ایک دن پٹائی کی اور کہا کہ پڑھنا لکھنا سارے بائیس، آسمان پر چڑھے گا۔

شمس کے گاؤں میں کچھ لوگ آریہ سماج کے ممبر بن گئے۔ان کے یہاں شیوامترہ، سرسوتی اور ہندو میگزین آنے لگا ان چیزوں کو شمس اور شیونند بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ ہندو پنچ مسلمان کے خلاف زہراُ گلا کرتا تھا۔ مگر اس بات کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی۔ میگزین پڑھنے کا شوق ایسا گہرہ ہوا کہ مرلی گاؤں جا کر میگزین لانے کی بات ٹھان لی۔شیونند نے بتایا کہ مرلی گاؤں میں دسہرا کی چھٹی میں پھوپھیرے بھیا جمشید پور سے آئے ہیں جو اکثر بہت سارے میگزین لاتے ہیں چلو ان سے میگزین چل کر مانگا جائے۔دونوں 'مرلی' کے لئے روانہ ہو گئے۔مرلی اور بمن گرام کے بیچ ریلوے لائین پڑتی ہے جس کے دونوں جانب تار کی باڑھ لائین کے متوازی بنادی گئی ہے۔اور آمد و رفت کا راستہ ریلوے پُل کے نیچے سے ہے۔دونوں مرلی پہنچے میگزین حاصل کیا اور پھر واپس لوٹے۔تین بجے شام کو دونوں ریلوے لائین کے پاس واپس آئے۔دونوں کا ارادہ بدلا کہ کچھ تار کاٹ لیا جائے اس میں کپڑا باندھ کر اور کراسن تیل میں ڈبو کر لُکاری بھانجنے میں بڑا مزہ آئیگا یہ سنٹھی کی لُکاری سے زیادہ دیر رہے گا۔پھر دونوں ایک باڑھ سے تار کھولنے لگے۔پرچوں اور رسائل کو دھان کی کھیت کی میڑھ پر رکھ دیا۔

ابھی تھوڑا سا ہی تار کھول پائے تھے کہ دور سے آواز آئی اے مادھو، اے شیو نندن۔دونوں چونکے سر اٹھا کر دیکھا تو پُل کے پاس گرو جی دیونارائن تیواری اور ان کے ساتھ دو آدمی اور کھڑے تھے۔اب کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔دونوں کانپنے لگے۔پھر آواز آئی یہاں آؤ۔کشاں کشاں گرو جی کے پاس پہنچے پیٹھ پر چھڑیاں برسنے لگیں۔ریلوے کے سامانوں کی چوری۔شرم نہیں آتی ڈوب مرو۔دونوں سسکیاں لینے لگے۔تبھی کھیتوں میں کام کرنے والوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔گرو جی کا پارہ ٹھنڈا ہوا تو کہا گھر جاؤ۔دونوں گھر آئے مگر میگزین میڑھ پر چھوڑ آئے تھے اس لئے دونوں صبح سویرے گھر سے نکل پڑے اور میگزین لے آئے۔مگر ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ جو تار کھول چکے تھے اسے گھر لے جائیں۔

شمس جب راج محل ہائی اسکول کے ہوسٹل میں رہتے تھے تو ہوسٹل سے بالکل سٹا ہوا ایک مندر تھا۔ وہاں پر کشتی کا ایک اکھاڑہ [illegible] کشتی کا دنگل دیکھنے ایک دیوار پر بیٹھ جاتے تھے۔ کچھ سینیر بھی کشتی [illegible] کرتے تھے [illegible] ایک دن شمس کو بھی جوش آ گیا وہ ایک ساتھی کو چیلنج دے بیٹھے اور اکھاڑہ میں اتر گئے مگر فوراً ہی چاروخانے چت تھے۔ بڑے شرمندہ ہوئے مگر تین چار ماہ کے بعد شمس نے پھر اسی لڑکے کو چیلنج دیا اس بار شمس نے کمال کر دیا اپنے حریف کو دو دو بار پٹخ دیا۔ ایک دن شمس جب اپنے کلاس سے جا رہے تھے تو اسی لڑکے نے ایک ستون کی اوٹ سے نکل کر لنگی مار دی۔ شمس پختہ فرش پر منہ کے بل گر پڑے۔ ان کے دانت اور منہ سے کافی خون نکلا۔ مگر شمس نے چُپ چاپ اُٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور کلاس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہندی کلاس چل رہا تھا۔ استاد ایک دوہے کی تشریح کر رہے تھے۔

جہاں دیا تہہ دھرم ہے　　　　جہاں چھما تہہ آپ

اس دوہے کو سن کر شمس نے دل ہی دل میں اس لڑکے کو معاف کر دیا۔

ایک دن فارسی کے کلاس میں شمس بغیر ٹوپی کے پہنچ گئے۔ مولانا نے خفگی کا اظہار کیا اس پر شمس کی زبان سے مولانا کی شان میں کچھ گستاخانہ کلمے نکل پڑے۔ مولانا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور چُپ چاپ کلاس چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اگلی گھنٹی میں جب وہ جنرل کلاس میں آئے تو محسوس کیا کہ کسی غیبی ہاتھ نے انکے گال پر بڑے زور کا طمانچہ مارا۔ شمس محو حیرت رہ گئے۔ اور شدید تکلیف کے ساتھ ساتھ شرمندگی کا احساس ہوا۔ شام میں مولانا کے گھر پہنچے اور پاؤں پکڑ کر معافی مانگی۔ طرفہ تماشہ یہ کہ مولانا لگے رونے اور شمس کو معاف کر دیا۔ اور کہا بزرگوں کا دل دکھانا نہیں چاہئے خدا ناراض ہوتا ہے۔ تب شمس نے طمانچہ والے واقعہ کو سنایا مولانا نے سن کر کہا خدا کا شکر ادا کرو تمہاری اصلاح ہو گئی۔ مگر آج تک وہ طمانچہ شمس کے لئے عجیب وغریب تہہ دار واقعہ ہے جس کا راز آج تک وہ نہیں جان سکے۔

تعلیم

غربت کے باوجود عبدالرحیم صاحب کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بڑی فکر تھی۔ شمس صاحب جب پانچ چھ سال کے ہوئے تو اپنی بڑی بہن پاروتی کے حوالے کر دیا کہ وہ انہیں پڑھائیں۔ جب عم پارہ انہوں نے شروع کیا تب انکے والد نے انہیں تین پہاڑ لور پرائمری اسکول میں گروجی کے حوالے کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں یہ لور پرائمری اسکول کے طالب علم تھے۔ جہاں ہندی کے علاوہ عم پارہ، قرآن شریف اور اردو کی کتابیں (اسمعیل میرٹھی کی اردو کی پہلی دوسری اور حکایت شیریں) پڑھنے لگے۔ حساب، تاریخ، جغرافیہ، پراکرتی پاٹھ، سواتھ سکشا وغیرہ کتابیں ہندی میں پڑھنے لگے۔ اصلاً یہ طالب علم تو ہندی کے رہے۔ مگر اردو بھی انہوں نے سیکھی۔ اس اسکول میں بہت دنوں سے یہ ہوتا چلا آ رہا تھا کہ گروجی کسی لڑکے کو اسکالرشپ امتحان کے لئے منتخب کر لیتے تھے اور اسے تیسری کلاس میں ایک سال اور روک لیتے تھے۔ اس بار گروجی کی نظر شمس صاحب پر پڑی۔ یہ ۱۹۲۸ء میں تیسری کلاس میں تھے اور ۱۹۲۹ء میں بھی انہیں اسی کلاس میں رہنا پڑا۔ ۱۹۲۹ء کے دسمبر میں گروجی شمس کو لے کر تال جھاڑی جو تین پہاڑ سے چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے، مشنری مڈل اسکول گئے، جہاں اسکالرشپ کا امتحان ہونا تھا۔ وہاں کسی ممتحن نے شمس سے پوچھا کہ تم اردو میں امتحان دو گے یا ہندی میں۔ اس سوال کے سمجھنے میں انہیں غلطی ہوگئی اور کہہ دیا کہ اردو میں۔ اب امتحان ہال میں انکے پاس جو بھی پرچہ آرہا ہے وہ اردو میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امتحان میں یہ بری طرح ناکام رہے۔ اس اسکول سے ہر سال ایک لڑکے کو اسکالرشپ ملتی تھی۔ مگر شمس صاحب ناکام رہے۔ گروجی انہیں لے کر ۹ رجنوری ۱۹۳۰ء کو راج محل گئے اور وہاں ہائی اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ اس زمانہ میں پورے راج محل سب ڈویژن میں صرف دو ہی اسکول

تھے۔ایک راج محل میں دوسرا صاحب گنج میں۔جب انکا داخلہ ہائی اسکول میں ہوا، انکے بڑے بھائی عبدالرزاق صاحب کو آپریٹو بینک میں ملازم تھے اور راج محل میں ہی ان کا آفس تھا۔انکے بھائی اور والدعبدالرزاق دونوں نے مل کر اسکول کے اخراجات برداشت کئے۔شمس ہوسٹل میں رہنے لگے۔دوسرے سال ۱۹۳۱ء میں انکی اسکول فیس اور ہوسٹل کا سیٹ رینٹ معاف ہوگیا۔اور یہ خصوصی رعایت میٹرک تک رہی۔خرچ کے لئے انہیں صرف آٹھ روپیہ ماہوار ملتا تھا۔اس وقت آٹھ روپئے ناشتہ کھانا اور دوسرے اخراجات کے لئے کم نہ تھے۔جب یہ آٹھویں جماعت میں آئے تب ایک تحصیلدار صاحب جن کا مکان راج محل سے ڈیڑھ میل دور تھا، اسکول آئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا کہ اگر کوئی غریب لڑکا ہو تو اسے میرے یہاں رکھوا دیجئے۔وہ وہاں ہی رہیگا اور میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھائے گا۔ہیڈ ماسٹر صاحب کی نظر انتخاب شمس پر پڑی۔۱۹۳۴ء کے اپریل میں یہ تحصیلدار صاحب کے یہاں چلے گئے اور روز پاپیادہ اسکول حاضر ہونے لگے۔۱۹۳۶ء میں جب یہ دسویں جماعت میں آئے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں ہوسٹل میں بلایا۔گھر سے پھر وہی آٹھ روپیہ ماہوار بطور خرچ ملنے لگا۔اس زمانہ میں کلاس چار سے سات تک ذریعہ تعلیم اردو اور ہندی تھا، انگریزی لازمی تھی اور کلاس آٹھ سے ذریعہ تعلیم انگریزی ہوجاتی تھی۔اسکے ساتھ ساتھ ہندی والوں کو سنسکرت اور اردو والوں کو فارسی پڑھنا لازمی تھا۔شمس صاحب چونکہ ہندی کے طالب علم تھے اس لئے انہیں سنسکرت بھی پڑھنی پڑی۔کچھ لڑکے حساب بھی Additional لیا کرتے تھے۔دو تین ماہ بعد انہوں نے دیکھا کہ پرنسپل اور ایڈیشنل سنسکرت میں کافی محنت کرنی پڑتی ہے اور وقت بھی برباد ہوتا ہے۔دوسرے موضوعات میں محنت کرنے کا وقت نہیں ملتا۔تب یہ ایک دن اسکول کے ہیڈ مولوی جناب سیّد افضال حسین صاحب کے پاس انکے ڈیرے پر گئے اور فارسی پڑھنے کی بات کہی، مولانا صاحب نے کچھ ڈکٹیشن دئے، ایک دو خطوط لکھوائے۔حروف میں پختگی نہ تھی۔املا کی بھی کئی غلطیاں تھیں اور بچّ

میں تو بہت سے الفاظ غلط تھے۔مگر پھر بھی مولانا صاحب نے کہا کہ اگر تم پڑھنا چاہو تو ایک گھنٹہ روز شام کو میرے یہاں آجایا کرو اور اسکے بعد شمس صاحب اردو کے کلاس اٹینڈ کرنے لگے۔شام کے وقت افضال صاحب انہیں اردو فارسی کی تعلیم دینے لگے۔شمس نے بھی بڑی کڑی محنت کی اور اپنی جماعت میں ان دو موضوعات میں بھی کافی دسترس حاصل کر لی۔مولانا صاحب نے انکے نام سے ''عالمگیر''لاہور اور''صوفی'' دہلی اور''مست قلندر''لاہور جاری کرادئے۔''نگار''لکھنؤ،''ہمایوں''لاہور اور''ندیم'' گیا اسکول کی لائبریری میں آتے تھے۔یہ سارے پرچے شمس صاحب کے مطالعہ میں آنے لگے۔''مفتاح القواعد'' کو مولانا صاحب نے اس خوش اسلوبی سے پڑھایا کہ آج بھی شمس کو یہ اسباق یاد ہیں۔اردو میں انہوں نے اتنی ترقی کرلی کہ ۱۹۳۷ء میں انکا ایک افسانہ'' شادکام''طلبا نام کے ماہنامہ میں'جو پورنیہ سے شائع ہوتا تھا' شائع ہوا اور اسکے بعد ہی انکا دوسرا افسانہ اسی پرچہ میں''عبرت'' شائع ہوا۔۱۹۳۷ء میں یہ میٹرک میں تھے۔اس زمانہ میں میٹرک کے طلباء کو امتحان دینے کے لئے بھاگلپور جانا پڑتا تھا۔اس بھاگلپور مرکز میں،سنتھال پرگنہ،ڈمکا،مونگیر،بھاگلپور اور پورنیہ اضلاع کے میٹرک کے طلباء امتحان دینے آتے تھے۔ان اضلاع کا یہی ایک مرکز تھا۔بھاگلپور امتحان دینے کے لئے آنا شمس کے لئے ایک مشکل مرحلہ تھا،مگر انکے مہربان ہیڈ ماسٹر صاحب نے Poor Boy's Fund سے پچیس روپئے دئے،والد نے پانچ اور بھائی نے دس۔ اس طرح چالیس روپئے لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ حساب کے استاد شری سریش بابو کی قیادت میں یہ بھاگلپور آئے۔

میٹرک کا امتحان انہوں نے سیکنڈ ڈویژن سے ۱۹۳۸ء میں پاس کیا۔نتیجہ شائع ہونے کے ایک ہفتہ بعد یہ اپنے اسکول راج محل گئے،ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملاقات کی،انکی مہربانیوں اور داد و دہش کا شکریہ ادا کیا۔ہیڈ ماسٹر صاحب نے خود اپنے قلم سے انہیں سرٹیفکیٹ عنایت کی اور بہت دعائیں دیں اور امید ظاہر کی کہ تم ہمارے اسکول کا

نام روشن کرو گے۔ بہت سی نصیحتیں کرنے کے بعد انہیں رخصت کیا۔ سیّد افضال حسین صاحب نے بھی انہیں ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

شمس صاحب نے راج محل سے آنے کے بعد اپنے والدین سے کالج میں پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس وقت پورے بھاگلپور کمشنری میں صرف ایک کالج تھا ٹی.این. جے کالج جو اب ٹی.این. بی کالج کہلاتا ہے۔ وہاں پڑھنے کے لئے کالج کی فیس اور قیام وطعام کا بڑا سنگین مرحلہ سامنے تھا۔ قیام وطعام کے لئے یا تو ہوسٹل میں رہتے یا کسی میس میں یا اگر قسمت یاوری کرتی تو کسی جاگیر کا انتظام ہوجاتا۔ بھاگلپور شمس صاحب کیلئے بالکل اجنبی شہر تھا۔ والدین اور بڑے بھائی نے اپنی مجبوری دکھائی۔ شمس صاحب کے ایک دوست عبدالرزاق اسی کالج میں تھرڈ ائیر کے طالب علم تھے اور تین پہاڑ کے رہنے والے تھے، اُن ہی کے پاس بھاگلپور چلے گئے۔ ان سے کسی جاگیر کے انتظام کیلئے کہا۔ انہوں نے ہفتہ عشرہ میں خط لکھنے کو کہہ کر شمس کو واپس بھیج دیا۔ آٹھویں روز انہیں خط ملا کہ اپنے سامان اور کچھ روپیوں کے ساتھ آجاؤ میں کتاب کا انتظام کردونگا۔ شمس ہائی اسکول کے زمانہ میں ہر ماہ کسی نہ کسی طرح ایک روپیہ بچا کر اپنے پاس رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ہیڈ ماسٹر صاحب نے امتحان کے وقت جو روپے دئے تھے اس میں سے چھ روپیہ بچا لئے تھے۔ اس طرح کل تیس روپیوں کے ساتھ مع بستر وہ بھاگلپور چلے گئے۔ جاگیر کا انتظام صدر اسپتال کے کمپاؤنڈر عبدالرزاق کے یہاں ہوگیا تھا۔ انکے بڑے لڑکے عبدالجلیل ماہرؔ ایک نامی گرامی حکیم تھے۔ ماہرؔ کے چھوٹے بھائی علی جو چار پانچ کلاس کے طالب علم تھے انکو پڑھانے لگے۔ معاوضہ میں صرف قیام وطعام کا انتظام تھا۔ انہوں نے فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا۔ موضوعات لوجک، تاریخ اور فارسی رکھے۔ انگریزی اور اردو لازمی موضوعات تھے۔ لوجک کے پروفیسر زین العابدین صاحب اور فارسی کے عبدالاحد صاحب تھے۔ تاریخ کے استاد تھے شری ماکھن لال اور کے. کے بوس عبدالاحد صاحب اردو بھی پڑھاتے تھے کیونکہ تھوڑے دنوں قبل اردو فارسی

کے پروفیسر جناب انور صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔نوشاد صاحب کی جگہ مسٹر کھوسلہ پرنسپل ہو کر آ گئے۔کالج میں بھی استادوں کی نظر شمس صاحب پر بڑی مشفقانہ تھی خصوصاً زین العابدین صاحب اور عبدالاحد صاحب کی۔

دوسرے یا تیسرے مہینے میں حکومت بہار نے انصاریوں کی کالج فی معاف کر دی اور فیس کی مد میں لی گئی رقم واپس کر دی گئی۔اس طرح انہیں کالج فیس سے نجات مل گئی۔مگر پھر بھی جیب خرچ تو کچھ چاہئے تھا اور اسکا بھی انتظام انکے والدین نہیں کر سکے۔انہوں نے ایک فلائنگ ٹیوشن کر لیا جو ڈیرہ سے ایک میل دور تھا اور معاوضہ پانچ روپیہ ماہوار۔مگر تیسرے ماہ ہی انہیں جواب دے دیا گیا،شاید کوئی ٹرینڈ ٹیچر مل گیا تھا۔انہوں نے کئی جگہ اور کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔نتیجتاً ۱۹۳۹ء میں جب یہ سیکنڈ ائیر کے طالب علم تھے جولائی میں گھر واپس آ گئے اور اپنے والد سے بولے کہ اگر دس روپے مہینہ کا بھی انتظام نہیں کیجئے گا تو میری پڑھائی نہیں ہو سکتی۔انکے والد صاحب خاموش رہ گئے۔اس طرح انکی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پروفیسر عبدالاحد کو جب ان باتوں کا علم ہوا تب انہوں نے دو تین بار عبدالرزاق کے معرفت خبر بھیجی اور خط بھی لکھا کہ تم واپس آ جاؤ کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔مگر شمس صاحب کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی تھی،دل ٹوٹ گیا تھا اور خواب چکنا چور ہو چکے تھے نتیجتاً یہ صرف میٹرک کیولیٹ ہی رہ گئے۔

۱۹۴۰ء کے اپریل میں ایک روز چپ چاپ ایک سوٹ کیس کے ساتھ گھر سے نکل کر کشن گنج چلے آئے۔یہاں ایک مختار صاحب کے ڈیرہ پر ٹھہرے۔انکا نام مختار معبود بخش تھا۔دو تین دنوں بعد ظفیر نامی ایک شخص سے ملاقات ہوگئی۔اسی نے آٹھ روپیہ ماہوار پر ٹیوشن کا انتظام کر دیا۔اس طرح یہ بڑے مزے سے کشن گنج میں رہنے لگے۔ایک ماہ بعد انہوں نے گھر والوں کو خبر دے دی کہ کشن گنج میں ہیں اور مزے سے ہیں۔

اس وقت حکومت برطانیہ نے یہ سہولت دے رکھی تھی کہ میٹرکیولیٹ لڑکے پراؤیٹ سے قانون کا امتحان پاس کرفوجداری کچہری میں پریکٹس کر سکتے تھے۔ایک دن ۱۹۴۱ء میں، مختار بخش صاحب نے انہیں کہا کہ ٹیوشن کرکے تو زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔تم میری قانون کی کتابوں کا مطالعہ کرو اور آئندہ سال امتحان میں بیٹھ جاؤ۔ یہ رائے انہیں پسند آئی اور انہوں نے دل لگا کر محنت کرنی شروع کردی ۱۹۴۲ء میں انہوں نے فارم وغیرہ بھر کر پٹنہ بھیج دیا۔۱۲راگست کو پٹنہ سینٹ ہال میں امتحان تھا۔ پہلے یہ مکان گئے پھر ۸راگست کو پٹنہ کیلئے روانہ ہو گئے۔ جب ٹرین بھاگلپور پہنچی تو معلوم ہوا کہ آگے کا پُل کانگریسیوں نے توڑ دیا ہے۔پھر پندرہ منٹ بعد یہ خبر آئی کہ بھاگلپور اور سبور کے درمیان ایک اور پُل کو توڑ دیا گیا ہے۔گاڑی بھاگلپور ٹھہر گئی۔سارے مسافر اتر گئے۔

امتحان ملتوی ہو گیا اور یہ ملتوی شدہ امتحان اکتوبر میں ہوا۔ اُمیں وہ شامل ہوئے۔اس امتحان میں پورے بہار سے چارسو اُنتّر لڑکے شریک ہوئے اور صرف ۳۸ لڑکے کامیاب ہوئے، ان کامیاب لڑکوں میں شمس صاحب بھی تھے۔مارچ ۱۹۴۳ء میں انہیں پریکٹس کرنے کا لائسنس مل گیا اور ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء سے انہوں نے پریکٹس کرنی شروع کردی۔۱۹۴۵ء میں حکومت ہند نے ایڈوکیٹ ایکٹ (Advocate Act) پاس کیا اور ۱۹۵۵ء میں انہوں نے Advocate کی سند حاصل کرلی۔

یوں تو شمس صاحب تعلیمی حیثیت سے صرف میٹرکیولیٹ ہیں کالج میں صرف ایک ڈیڑھ سال رہے۔مگر انکا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ صاحب علم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔اردو، ہندی، سنسکرت، بنگلہ، عربی، فارسی اور انگریزی میں انہیں دسترس حاصل ہے۔انہوں نے مذہبیات کا مطالعہ اپنے خاص نقطۂ نظر سے کیا ہے۔اس لئے سیرت پر انکی تقریر بالکل انوکھی اور دلچسپ ہوتی ہے۔

★★★

شمس کے اساتذہ کرام

ہوش سنبھالتے ہی یہ اپنی پھوپھی پاروتی سے اردو قاعدہ پڑھنے جانے لگے۔ ایک سال بعد یہ لور پرائمری اسکول تین پہاڑ میں داخل ہوئے۔ یہاں شری دیونارائن تیواری اور بیکنٹھ جھاہندی اور حساب کے استاد تھے۔ انکے حقیقی چچا مولوی میاں جان اردو اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ لوگ بہت شفقت و محبت اور توجہ سے پڑھاتے تھے مگر ذرا ذرا سی غلطی پر پیٹا بھی خوب کرتے تھے۔

پھر یہ ہائی اسکول راج محل میں داخل ہوئے۔ سید تفضل حسین صاحب (جو کھجوا ضلع چھپرہ کے باشندہ تھے) انگلش اور تاریخ پڑھایا کرتے تھے، ہیڈ ماسٹر جناب کالا چاند ڈے نے بھی انگریزی کی تعلیم دی تھی۔ انگلش کے ایک اور ٹیچر ڈھاکہ کے رہنے والے تھے، شمس کو نام یاد نہیں، وہ بالکل انگریزوں کے لب ولہجہ میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ انہوں نے انگریزی نظم کے اوزان سے متعلق بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ جس سے انگریزی نظم پڑھنے میں کبھی دقت نہیں ہوئی۔ ثانوی درجہ میں اردو فارسی بڑی لگن سے ہیڈ مولوی جناب سید افضال حسین سے سیکھی وہ شمس سے بے حد شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ مولانا کا ان سے والہانہ محبت کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہونے کے تقریبا دس بارہ برس بعد جب حج کو جانے لگے تو نوادہ سے کشن گنج شمس سے صرف ملاقات کرنے کے لئے آئے تھے۔ شمس ۱۹۳۸ء میں اسکول چھوڑ چکے تھے ۱۹۷۲ء تک دونوں میں ملاقات نہ ہوئی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ منٹ تک یہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے جب شمس نے پوچھا کہ آپ رجہت (نوادہ) سے آرہے ہیں۔ بولے ہاں بابو احمد سے ملنے آئے ہیں۔ سنا وہ وکیل بن گیا ہے اور وہ بڑے اچھے اچھے قطعات لکھتا ہے۔ یہ سنتے ہی شمس ان کے قدموں پر گر گئے۔

کالج میں انکے لوجک کے استاد سید زین العابدین صاحب تھے، تاریخ کے استاد شری ماکھن لال اور کے۔ بوس تھے اور انگریزی نظم ایس۔ سی۔ سرکار پڑھاتے تھے۔ مسٹر بی۔ جی صاحب نثر میں ایک ناول LORNA DONE پڑھاتے تھے۔ یہ

ناول بعد کو فلمایا بھی گیا۔ انکے علاوہ اور بھی انگلش کے استاد تھے، جنکے نام یاد نہیں۔ فارسی اور اردو جناب عبدالاحد صاحب پڑھاتے تھے۔

بھاگلپور آنے پر انہوں نے اپنی غزلیں اور نظمیں جناب یاسؔ بھاگلپوری کو دکھانی شروع کیں۔ یاس، جلیل مانکپوری کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ میں انکی غزلیں ندیم، ھمایوں عالمگیر وغیرہ موقر رسالوں میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ یاسؔ نے ان کو عروض کی تو کوئی خاص تعلیم نہیں دی۔ مگر انکے اشعار کے نوک پلک درست ضرور کئے۔

بھاگلپور میں ایک بار مشاعرہ ہوا۔ جس کا مصرع اس طرح تھا

''دل میں کچھ روز تو ناوک تیرا مہمان رہے''

اس پر شمسؔ نے بھی غزل لکھی۔ یاسؔ صاحب انکا مقطع سن کر پھڑک اٹھے۔ مقطع تھا

ساقئی توبہ شکن ہاں تیری آنکھوں کی قسم
شمسؔ آئے ہیں ذرا پھر وہی سامان رہے

استاد نے کہا کہ بھئی شعر تو خوب ہے۔ مگر ''پھر وہی'' کا جواز پہلے مصرع سے پیدا نہیں ہوتا۔ تم ''تیری آنکھوں کی جگہ'' تجھے موسم کی'' لکھ کر دیکھو' شعر کتنا بدل گیا۔ اس مشاعرہ میں جناب ولی الرحمان ولی کاکوی بھی موجود تھے۔ شمسؔ کے اس مقطع پر وہ بڑی دیر تک سر دھنتے رہے اور اسے بار بار پڑھواتے رہے۔

بھاگلپور چھوڑنے کے بعد بذریعہ خط و کتابت یہ جناب یاسؔ صاحب سے اصلاح لیتے رہے اور پھر انکے انتقال کے بعد ۱۹۴۴ء سے یہ باضابطہ طور پر جناب سید محی الدین صاحب تمنا عمادی مجیبی پھلواری کے شاگردی میں آ گئے۔ تمنا صاحب نے انہیں فن عروض کی تعلیم بڑی توجہ سے دی۔ جو شعر انہیں پسند آجاتا تھا اس پر ''ص'' بنا دیا کرتے تھے۔ مگر شمسؔ کی بدقسمتی کہ یہ سلسلہ بہت جلد منقطع ہو گیا۔ حضرت تمنا ۱۹۴۶ء میں پھلواری شریف سے ڈھاکہ چلے گئے۔ اسطرح شمسؔ صاحب فارغ الاصلاح کی سند اپنے استاد سے نہ لے سکے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک یہ کسی دوسرے کی غزل پر اصلاح نہیں دیتے ہیں۔

★★★

39

زندگی کے اہم واقعات

۱۹۴۲ء کے اگست میں جب یہ قانون کا امتحان دینے کے لئے پٹنہ جا رہے تھے۔ کہ بھارت چھوڑو کا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ کانگریس کے تقریباً سبھی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ ہر ہندوستانی اپنی جگہ پر آپ اپنا لیڈر ہے۔ ٹرین بھاگلپور پلیٹ فارم پر رُک گئی۔ دو روز بھاگلپور میں رہنے کے بعد یہ ایک کشتی سے کہلگاؤں اور پھر کہلگاؤں سے بذریعہ بیل گاڑی اپنی ننیہال باراہاٹ پہنچے۔ چونکہ یہ کانگریس سے ذہنی طور پر متاثر تھے۔ یہ بھی توڑ پھوڑ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک ہو گئے اور جب سرکار برطانیہ کی طرف سے سختی شروع ہوئی تب یہ روپوش ہو گئے روپوشی کا زمانہ انہوں نے زیادہ تر باراہاٹ میں گزارا۔ مگر انکے ماموں جان اور خالو جان کو ان کا گزاریوں کا مطلق علم نہ تھا۔ انکے ماموں جان نے شمس کی شادی انکی خالہ زاد بہن سے طئے کردی اور آٹھویں دن ایک سادہ تقریب میں انکا عقد پڑھادیا گیا ۱۹۴۴ء کے اگست یا ستمبر میں شمس صاحب اپنی بیگم کو کشن گنج لے آئے۔ ۱۹۴۵ء میں شمس صاحب بیٹی کے باپ بنے۔ اسکا نام انوری رکھا گیا۔ مگر ایک مہینہ کے بعد انکی بیگم کی طبعیت خراب رہنے لگی اور چند دن علیل رہ کر رحلت کر گئیں۔ چار ماہ بعد انوری بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ شمس صاحب نے صرف ایک شعر پڑھا اور خاموش ہو گئے۔

انوری درد ہجر سہہ نہ سکی

اپنی ماں کے بغیر رہ نہ سکی

اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو پورنیہ سے انہیں ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کی دعوت ملی جس میں ہندوستان کے نامور ہندی شعراء شریک ہو رہے تھے۔ دنکر، بچن، سمترا نند پنڈت اور اس قبیل کے دوسرے شعراء۔ اس مشاعرے میں پورنیہ ضلع کے اردو شعراء کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مگر دوسرے روز جب وہ پورنیہ جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک رقعہ موصول ہوا جس میں ان کی بیگم کی رحلت کی خبر تھی۔ شمس کشمکش میں پڑ گئے کریں تو کیا کریں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آیا مگر مشاعرے میں شرکت کی خاطر چل پڑے کیونکہ ان تمام شعراء کو وہ میگزین میں پڑھتے رہتے تھے مگر آج انہیں موقع ملا تھا کہ قد آور شعراء کرام کا کلام ان کی زبانی سنیں، وہیں ان کی پہلی ملاقات پھنیشور ناتھ رینو (میلا آنچل کے مصنف) سے ہوئی۔ اس مشاعرے میں شمس نے بھی اپنی نظم سنائی۔ اور صبح سویرے بھاگلپور کے لئے روانہ ہو گئے اور پھر ۱۹۴۸ میں ان کی دوسری شادی میمونہ خاتون سے ہوئی جو مینہاری (کٹیہار) کی رہنے والی تھیں۔

★★★

رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۳۵ء

اسکول میں اکثر رابندر ناتھ ٹیگور کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور اسکول کے لڑکوں نے عجیب روایتیں انکے متعلق گڑھ رکھی تھیں۔ جب معلوم ہوا کہ شانتی نکیتن بول پور ہی کے پاس ہے، تب شمس صاحب اپنے ایک بنگالی ہم جماعت کے ساتھ ۱۹۳۵ء فروری میں سرسوتی پوجا کے موقع پر بول پور کیلئے روانہ ہو گئے۔ جو زیادہ دور نہیں تھا۔ شانتی نکیتن سے کچھ فاصلہ پر شری نکیتن ہے وہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ دونوں لڑکے شانتی نکیتن گئے۔ Campus کے باہر سڑک کے کنارے ایک چائے خانے پر ٹھہر گئے۔ پھر میلہ گھومنے گئے اور چار بجے تک لوٹ آئے ہوٹل والے سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس وقت ابھی گرودیو (رابندر ناتھ ٹیگور) اپنے تو اس استھان میں ہونگے اور باہر چبوترہ پر بیٹھے ہونگے۔ یہ مکان باغیچہ اور یونیورسٹی کیمپس پار کرنے کے بعد اتر پورب گوشہ میں ہے۔ یہ دونوں لڑکے وہاں کیلئے روانہ ہو گئے اس جگہ پہنچے تو دیکھا کہ ایک شخص آرام کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ لمبی لمبی داڑھی تھی اور سر کے لمبے لمبے بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ چہرہ سیب کی مانند سرخ تھا۔ وہ لوگ وہاں ٹھہر گئے۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا خوش پوش آدمی آیا اور پوچھا'' تومرا ایکھانے کینو اسی چھ، کتھائے تھیکے آچھے''۔ شمس کے بنگالی ساتھی نے بنگلہ میں کہا۔ ہملوگ بہار سے گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کو دیکھنے آئے ہیں۔ وہ شخص دونوں کو گرودیو کے پاس لے گیا۔ گرودیو نے بیٹھنے کو کہا۔ نام پوچھا۔ شمس پر کچھ ایسا رعب طاری تھا کہ پاؤں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ انکا بنگالی ساتھی بیدناتھ تو بات کرتا رہا مگر شمس ٹک ٹکی باندھے گرودیو کو دیکھتے رہے۔ گرودیو نے اپنے خادم سے کہا کہ'' چھیلے را کہ کچھو داؤ''۔ ناشتے کے بعد دونوں چلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے جھک کر پرنام کیا۔ گرودیو نے آشیرواد دیتے ہوئے چند کلمات کہے تھے جو شمس کو یاد نہیں لیکن دو لفظ آج بھی یاد ہیں وہ تھا'' گیان۔۔۔۔۔ بھگتی''۔

اس طرح شمس کی ملاقات ایک عالمی شہرت کے ادیب سے ہوئی۔

معمولاتِ شمسؔ

بچپن سے ہی انکا مزاج سادگی پسند تھا۔ شاید گھر کی غربت نے انہیں قناعت پسند بنا دیا تھا۔ اسکول بھی چست پائجامہ اور چھینٹ وغیرہ کا کرتا پہن کر جاتے تھے۔ البتہ ہائی اسکول کے زمانہ میں ترکی ٹوپی کا اضافہ ہوگیا اور لنگی کیلئے مارکین کا کپڑا خریدتے تھے۔

کچہری جوائن کرنے کے وقت کچھ لوگوں نے کوٹ پینٹ اور ٹائی وغیرہ پہننے کا مشورہ دیا۔ مگر انہوں نے پائجامہ اور شیروانی کو ترجیح دیا۔ کوٹ کبھی کبھی زیب تن کر لیتے تھے۔ مگر انہوں نے پتلون نہیں پہنی اور قیمتی لباس سے پرہیز کرتے رہے۔

گرمیوں میں مکان پر یہ لنگی اور ہاف قمیض میں نظر آتے اور جاڑے میں ہاف قمیض کی جگہ کھادی کا فُل کرتا ہوتا۔ سونے کیلئے نہ کوئی قیمتی پلنگ تھا اور نہ ہی موٹا گدے دار بستر۔ سے ۱۹۵۴ء تک انکی چوکی پر صرف ایک دری چادر اور تکیہ ہوا کرتا تھا۔ ایک دن انکے دوست میاں کفایت نے ان سے کچھ روپئے بطور دست گرداں لئے اور دوسرے دن ایک توشک بنوا کر لیتے آئے۔ کہنے لگے، ارے بھائی! مال بہر آسائش تن است۔ اپنے کو اس قدر تکلیف دینے سے کیا فائدہ۔ تم کوئی رشی مُنی تو نہیں۔ شمس نے کہا بچپن سے عادت پڑ گئی ہے۔ تم شاید جانتے ہو کہ میں مہینوں ریلوے پلیٹ فارم پر اور ہاٹ کی سخت زمین پر سویا ہوں۔

انہیں بیڑی سگریٹ سے قطعی رغبت نہیں تھی۔

شاگرد

جہاں تک شعر وشاعری کا تعلق ہے۔انہوں نے کسی کو اپنا شاگرد نہیں بنایا۔کیونکہ انہیں فارغ الاصلاح کی سند نہیں مل سکی تھی۔کشن گنج میں بہت سے لڑکے اور کچھ معمر حضرات بھی انکے پاس اصلاح کیلئے آئے تھے۔مگر یہ انہیں بڑی خوبصورتی سے کسی دوسری جگہ بھیج دیتے تھے۔البتہ بے تکلف دوستوں کے کلام پر دوستانہ مشورہ ضرور دیتے۔باہر سے بھی بعض شعراء کے کلام بغرض اصلاح آتے تھے۔مگر یہ اصلاح کی بجائے اس فن سے متعلق باتیں حاشیہ پر لکھ دیتے اور مشورہ دیتے کہ اگر آپکے شہر میں کوئی شاعر ہیں تو ان سے رجوع کریں اور کچھ کتابوں کے نام دیتے کہ انکا مطالعہ کریں۔

رفیق انجم، محمد یحیٰ اور عشرت رحمانی کے کلام پر یہ اکثر دوستانہ مشورہ دیدیا کرتے تھے۔جہاں تک وکالت کا تعلق ہے۔جونیئر وکلاء ہمیشہ ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور انکے ماتحت کام کرنا اپنی سعادت مندی سمجھتے تھے۔ان جونیئر وکلاء میں بعض تو اتنے تیار ہو گئے کہ مقابل میں کھڑے ہونے لگے۔انکے ایک شاگرد پربھودیال اگروال آج کل رانچی ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں اور بہت کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔اس فن کے ایک شاگرد میدان سیاست میں کود پڑے اور عرصہ تک بہار کی وزارت میں ایک وزیر کی حیثیت سے رہے اور کافی نام پیدا کیا۔انکا نام ہے محمد حسین آزاد۔

ان کا کہنا تھا کہ زندگی کا مقصد ہی تو علم حاصل کرنا ہے۔جب ہم خود طالب علم ہیں تو پھر دوسروں کو کہاں تک تعلیم دے سکتے ہیں۔ہاں کسی حد تک رہنمائی کرنا ہی بڑی بات ہے۔

مذہبی عقائد میں بہت ہندو اور مسلمان انکے ہم خیال تھے۔وہ مذہبی نکتوں کو اس طریقہ سے پیش کرتے تھے کہ تھوڑی سی سوجھ بوجھ والا آدمی انکا ہم خیال ہو جاتا تھا۔ ان

کا قول ہے کہ اجتہاد کچھ نبوت تو نہیں جسکا خاتمہ ایک برگزیدہ ہستی پر ہو گیا ہو۔ یہ ضروری تو نہیں کہ برسوں پہلے جن مجتہدوں نے جن مسئلوں کو حل کیا اسے آج بھی ہم من وعن تسلیم کرلیں۔ دنیا ترقی پذیر ہے۔ سماج کا مزاج بھی ارتقاء پسند ہے دن رات تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس ماحول میں ہمیں ہر نکتہ پر آج کی روشنی میں غور کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں انکے بہت شاگرد پیدا ہو گئے۔ جو انکے خیال کو جابجا پھیلاتے رہتے ہیں۔ اسی اجمال کی تفصیل ان کے عقائد میں صاف طور پر جھلکتی ہے۔

★★★

سماجی، سیاسی اور مذہبی کارکردگی

سماجی

جب یہ دسویں گیارہویں جماعت میں پڑھتے تھے تب گاندھی جی کی دعوت پر انہوں نے نوجوانوں کا ایک گروہ محلے کی صفائی اور لوگوں کو قرینے سے رہنے کی تربیت کیلئے تیار کیا اور اس طرح کا گروہ ہر محلہ میں دوسرے لوگوں نے بھی بنایا۔ شمس ان کاموں میں فرصت کے اوقات میں لگ جاتے جس کا تذکرہ انکے ہیڈ ماسٹر فخر یہ انداز میں کیا کرتے تھے۔

ہائی اسکول کے سیکنڈ ماسٹر صاحب اسکول میگزین نکالنا چاہتے تھے۔ ایک ہی میگزین (رسالہ) میں، انگریزی، ہندی، بنگلہ اور اردو کے مضامین شامل کئے گئے۔ اردو حصہ کی ذمہ داری شمس صاحب کی تھی۔ انہوں نے اردو داں لڑکوں کو ترغیب دے دے کر ان سے بھی مضمون لکھوایا اور اسے اس پرچہ میں شامل کیا۔ اس رسالہ کو اسکول والوں نے اور شہر کے پڑھے لکھے طبقے نے بہت پسند کیا۔

ایک دن یہ ہوسٹل میں بیٹھ کر مسلمان لڑکوں سے مشورہ کرنے لگے کہ ہم لوگ بھی اردو کا ایک رسالہ نکالیں۔ لڑکے تیار ہو گئے اور رسالہ کا نام سوچنے لگے مگر کسی نام پر پوری

جماعت کا اتفاق نہیں ہو رہا تھا۔ شمس کے مشورہ پر ''الماس'' رکھا گیا۔ جسکے معنی ہیرا ہوتے ہیں۔ بہت جلد ایک رسالہ ہاتھ کا لکھا ہوا منظر عام پر آ گیا۔

کشن گنج آنے پر یہ بزم ادب کے ماہانہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور بہت جلد شہر کے ادبی حلقوں میں روشناس ہو گئے۔ یہاں سے سیّد مظہر بلگرامی ایک ماہنامہ نکال چکے تھے۔ جسکا نام ''جام'' تھا۔ مگر یہ ''جام'' عوام کے ہاتھوں میں آتے آتے چکنا چور ہو گیا۔ اسکا حشر دیکھ کر کوئی پرچہ نکالنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھے۔ مگر شمس صاحب کی جدو جہد سے ایک رسالہ ''الاحسان'' نکل ہی گیا۔ اسکی سر پرستی اس وقت کے ایم.ایل.اے. جناب احسان صاحب کر رہے تھے۔ مجلس ادارت میں یہ بھی شامل تھے اور چند ماہ تک یہ چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ یہ پرچہ بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ پھر کچھ برسوں کے بعد ایک اور پرچہ انہوں نے نکالا۔ جس کا نام ''ساحل'' تھا، اس میں نگراں رہے شمس صاحب اور ایڈیٹر رہے۔ محشر اعظمی و شمس شادمانی (دربھنگہ) انہوں نے اس پرچہ کو زندہ رکھنے کی بڑی سخت محنت کی۔ دیہات جاجا کر اس پرچہ کے خریدار بناتے اور کل روپیہ ادارے کے سپرد کر دیتے۔

۱۹۴۹ء میں کشن گنج میں رکشا کا رواج بڑھ گیا تھا اور میونسپلٹی نے جو کرایہ طئے کیا وہ بہت کم تھا۔ اس وقت شمس صاحب رکشا یونین اور بیل گاڑی یونین کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے چیرمین سے کرایہ میں اضافہ کی بات کہی مگر جواب نہیں میں ملا۔ مقامی دھرم شالہ میں ایک میٹنگ ہوئی جسمیں مختلف گوداموں میں کام کرنے والے مزدور بھی شامل ہوئے۔ گرما گرم تقریر یہ ہوئی اور انہوں نے کہا کہ حق مانگنے سے نہیں جدو جہد کرنے سے ملتا ہے۔ اس وقت ڈکٹر کلد یپ جھا بھی یہیں تھے۔ آخر مکمل ہڑتال کی بات طئے ہو گئی۔ انہوں نے S.D.O. کشن گنج چیرمین کشن گنج میونسپلٹی اور تمام مالکان گودام کو نوٹس بھیج دی کہ چودہ دنوں کے اندر اگر مطالبہ پورا نہیں کیا گیا تو پندرہویں دن سے غیر معینہ مدت کیلئے ہڑتال کر دی جائے گی۔ وہ نوٹس دے کر خاموش نہیں بیٹھے بلکہ ہر جگہ جاجا کر نرم و گرم لہجہ میں مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین

پات۔ آخر پندرہویں دن سے ہڑتال شروع ہوگئی۔ دو دن بعد ہی .S.D.O کشن گنج نے شمس کو بلایا۔ جہاں چیر مین میونسپلٹی اور کچھ مارواڑی حضرات بھی بیٹھے تھے۔ انکے بیچ تن تنہا مزدوروں کے نمائندہ شمس صاحب تھے۔ آخر بحث و مباحثہ کہ بعد پچھتر فیصد مطالبوں پر سب راضی ہوگئے۔ شمس صاحب اسے اپنی فتح عظیم سمجھ رہے تھے۔ فیصلے کے اعلان سے فضا جے جے کار کے نعروں سے گونج اٹھی، ہڑتال ختم ہوگئی۔ ڈکٹر کلد یپ جھا نے کہا کہ شمس صاحب آپ آدمی ہی کمزور ہیں۔ اگر ذرا سا اڑ جاتے تو سو فیصد مطالبہ منوا لیتے۔

کشن گنج میں اسپتال روڈ پر زمانہ دراز سے ایک مسجد ویران پڑی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کو کسی طوائف نے بنوایا تھا۔ مگر جب اسنے علماء کرام سے کہا کہ نماز پڑھ کر اس کا افتتاح کر دیجئے تو مقامی اور غیر مقامی علماء نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ سنایا کہ اس مسجد میں نماز نہیں پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ اس میں حرام کاری کی دولت لگی ہوئی ہے۔ آج بھی وہ ایک کھنڈر کی صورت میں برقرار ہے۔ اس عمارت سے مستقل تین چار کٹھہ زمین بھی ہے۔ پرانے دستاویز میں بھی اس عمارت کا نام مسجد ہے۔ اس خالی جگہ میں جنگل جھاڑ اُگ گئی ہیں اور مسجد کی دیوار میں ایک پیپل کا درخت نکل آیا ہے۔ جو آج کل بڑا تناور درخت بن گیا ہے۔

ایک دن ۱۹۵۸ء کے آغاز میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مسجد کی زمین جو خالی پڑی ہے اس پر ایک مسافر خانہ بنوا دیا جائے اور سڑک کے کنارے کنارے ڈکان کے لئے کچھ کمرے بنوا دیے جائیں۔ دوسرے دن سے اینٹ اور سرخی جمع ہونے لگی۔ چند تاجر ہندوؤں نے مسلمانوں سے کہا کہ جب کمرے بن جائیں تو چند ہم لوگ کو بھی تجارت کی خاطر دیا جائے۔ یہ سن کر ایک صاحب جو مسلمانوں کے خود ساختہ لیڈر بنے ہوئے تھے۔ ہندو قوم کے نام پر بدکلامی کرنے لگے۔ ان کی اس بلاوجہ کی حرکت پر آس پاس کے ہندوؤں نے احتجاج کیا اور چیلنج کیا کہ دیکھیں آپ لوگ یہاں کیسے مسافر خانہ بنواتے ہیں۔ ایک جن سنگھ کے سرگرم رکن نے تھانہ کو خبر کر دیا۔ داروغہ صاحب دوڑے

ہوئے آئے اور فریقین کو بلوہ کرنے سے منع کیا اور کہا کہ آپ لوگ کورٹ سے فیصلہ کرا لیجئے۔ مسلمان لیڈر نے پوچھا کہ جناب کورٹ جانے کی کیا ضرورت ہے جب ہم مسجد کی زمین پر مسافر خانہ بنوانے والے ہیں۔ داروغہ نے کہا کہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ یہ مسجد ہے۔ یہ تو ہندوؤں کا شیومندر ہے۔ بس ابھی داروغہ کی زبان سے یہ بات نکلی تھی کہ چاروں جانب ہوا گرم ہو گئی اور ہر ہندو کی زبان پر یہ بات تھی کہ ایک مندر کو مسلمان زبردستی مسجد کہہ رہے ہیں۔ دوسرے دن ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ ہو گیا اور پھر یہ ۱۴۴، ۱۴۵ ضابطہ فوجداری میں منتقل ہو گیا۔ مسلمانوں نے ایک دیوانی مقدمہ بھی ٹھوک دیا۔ جنم اشٹمی کے موقعہ پر ہندوؤں نے اعلان کر دیا کہ جلوس مع مورتی ہر سڑک سے گزرے گا۔ خصوصاً لائین مسجد کے متصل سڑک سے بھی اس جلوس کو ہم سب گزاریں گے۔ اب تک اس مسجد کے قریب سے کوئی ایسا جلوس نہیں گزرا تھا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا کہ کسی قیمت پر اس جلوس کو لائین مسجد کے قریب سے گزرنے نہیں دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین ماہ تک اس جلوس کا نکلنا ملتوی رہا۔ گرچہ اس درمیان دُرگا پوجا کے جلوس عام شاہراہوں سے گزار دیے گئے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے کلکٹر صاحب تشریف لائے اور دونوں گروپوں کے بیچ صلح و مصالحت کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی جانب سے چودھری فضل الرحمٰن، نظیر السلام اور جناب سید مہدی حُسین نمائندہ بنائے گئے۔ کافی بحث و تکرار کے بعد یہ طئے ہوا کہ صرف مورتی کو لیکر آٹھ دس آدمی اس مخصوص سڑک سے گزریں اور جلوس دوسرے راستے سے جا کر دونوں ڈے مارکیٹ پُل پر مل جائیں۔ اس فیصلے پر چند لوگوں نے تنقید کیا۔ مسلمانوں کو تو کسی جلوس سے پُرخاش نہیں۔ اگر اس کے مذہبی عقیدے کو ٹھیس پہنچتی ہے تو مورتی سے پہنچتی ہے۔ آپ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کیا کہ جلوس اس راستے سے گزرے اور مورتی دوسرے راستے سے۔ چودھری صاحب نے کہا کہ اب تو فیصلہ ہو چکا ہے۔ ملتوی شدہ جلوس ۶ جنوری ۱۹۵۹ء کی شام کو نکلا اور شمس کے مکان کی جانب سے مورتی گزرنے لگی اس میں شریک تقریباً بیس پچیس لوگ تھے۔ اور جلوس دوسرے راستہ سے گزر گیا۔ جب یہ مورتی

چودھری فضل الرحمٰن کے گھر سے آگے بڑھی اور مسجد کے قریب آنے لگی تو مسلمانوں نے اس پر پتھراؤ کرنا شروع کردیا۔لوگ مورتی کو سڑک کے کنارے رکھ کر الٹے پاؤں بھاگ چلے۔ چند ہی لمحے میں فضا نعرۂ تکبیر اور جئے جئے کار سے گونج اٹھی۔کلکٹر فورس لیکر جائے وقوع پر آدھمکے اور فریقین کو سمجھانے لگے۔اسی دوران ایک مسلمان نوجوان نے کلکٹر صاحب کے چہرہ پر دوطمانچے رسید کردیے۔کلکٹر صاحب نے اس نوجوان کا نام درج کیا پھر شمس کے دولت کدہ پر آئے پانی پیااور پھر چلے گئے۔دوسری صبح فجر کی اذاں ہورہی تھی پولیس آئی اس نے شمس کو آواز دیا۔شمس باہر نکلے۔ادھر چودھری صاحب بھی آئے ادھر مسجد کی طرف جاتے ہوئے محشر اعظمی پہنچے تینوں حضرات گرفتار کرلئے گئے،سورج نکلتے نکلتے ۲۰/۱۸ آدمی گرفتار ہوکر تھانہ آگئے۔بارہ بجتے بجتے آٹھ دس آدمی اور گرفتار کرلئے گئے،اس دن ضمانت کی درخواست مسترد کردی گئی۔کیونکہ گرفتاری ۳۰۷ تعزیرات ہند کے تحت ہوئی تھی۔پانچ روز تک حاجت میں رہنا پڑا۔پورنیہ جج کورٹ سے ضمانت ملی۔مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے خلاف مقدمہ دائر کردیا تھا۔ان کی بھی گرفتاری ہوئی تھی۔علماء دین شہر نے صلح ومصالحت کی گفتگو شروع کی۔اس سلسلے میں کلکٹر صاحب نے پہل کی۔ان کی صدارت میں ایک بیٹھک ہوئی۔انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جلد از جلد ہم لوگ آپس میں اس مسئلے کو حل کرلیں۔مگر دونوں فرقین کے بیچ تلخ وتند گفتگو شروع ہوگئی۔تب شمس نے کہا کہ دونوں طرفین اپنے اپنے نمائندے بنا کر پیش کریں اور تمام نمائندے جومل بیٹھ کر فیصلہ کرینگے اسے دونوں فریقین تسلیم کریں۔یہ بات مان لی گئی۔ہندوؤں کی جانب سے شری ہنومان جالانی،آنندی بابواور ڈاکٹر اجئے کمار مترا کے نام پیش کئے گئے مسلمانوں کے نمائندہ جناب چودھری فضل الرحمٰن،مختار محی الدین اور شمس منتخب ہوئے۔ناموں کے اس فہرست کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا گیا۔۱۲رجنوری ۱۹۵۹ءکو چودھری صاحب کے دولت کدہ پر ان چھ حضرات کی نشست ہوئی۔آنندی بابو

چودھری فضل الرحمن کے گھر سے آگے بڑھی اور مسجد کے قریب آنے لگی تو مسلمانوں نے اس پر پتھراؤ کرنا شروع کر دیا۔ لوگ مورتی کو سڑک کے کنارے رکھ کر الٹے پاؤں بھاگ چلے۔ چند ہی لمحے میں فضا نعرۂ تکبیر اور جئے جئے کار سے گونج اٹھی۔ کلکٹر فورس لیکر جائے وقوع پر آدھمکے اور فریقین کو سمجھانے لگے۔ اسی دوران ایک مسلمان نوجوان نے کلکٹر صاحب کے چہرہ پر دو طمانچے رسید کر دیے۔ کلکٹر صاحب نے اس نوجوان کا نام درج کیا پھر شمس کے دولت کدہ پر آئے پانی پیا اور پھر چلے گئے۔ دوسری صبح فجر کی اذاں ہو رہی تھی پولیس آئی اس نے شمس کو آواز دیا۔ شمس باہر نکلے۔ ادھر چودھری صاحب بھی آئے ادھر مسجد کی طرف جاتے ہوئے محشر اعظمی پہنچے تینوں حضرات گرفتار کر لئے گئے، سورج نکلتے نکلتے ۱۸،۲۰ آدمی گرفتار ہو کر تھانہ آ گئے۔ بارہ بجتے بجتے آٹھ دس آدمی اور گرفتار کر لئے گئے، اس دن ضمانت کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ کیونکہ گرفتاری ۳۰۷ تعزیرات ہند کے تحت ہوئی تھی۔ پانچ روز تک حاجت میں رہنا پڑا۔ پورنیہ جج کورٹ سے ضمانت ملی۔ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ ان کی بھی گرفتاری ہوئی تھی۔ علماء دین شہر نے صلح ومصالحت کی گفتگو شروع کی۔ اس سلسلے میں کلکٹر صاحب نے پہل کی۔ ان کی صدارت میں ایک بیٹھک ہوئی۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جلد از جلد ہم لوگ آپس میں اس مسئلے کو حل کر لیں۔ مگر دونوں فرقین کے بیچ تلخ وتند گفتگو شروع ہو گئی۔ تب شمس نے کہا کہ دونوں طرفین اپنے اپنے نمائندے بنا کر پیش کریں اور تمام نمائندے جو مل بیٹھ کر فیصلہ کرینگے اسے دونوں فریقین تسلیم کریں۔ یہ بات مان لی گئی۔ ہندوؤں کی جانب سے شری ہنومان جالانی، آنندی بابو اور ڈاکٹر اجئے کمار مترا کے نام پیش کئے گئے مسلمانوں کے نمائندہ جناب چودھری فضل الرحمن، مختار محی الدین اور شمس منتخب ہوئے۔ ناموں کے اس فہرست کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا گیا۔ ۱۲؍جنوری ۱۹۵۹ء کو چودھری صاحب کے دولت کدہ پر ان چھ حضرات کی نشست ہوئی۔ آنندی بابو نے کہا کہ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ ہر بات کو ہندو ماننے کو تیار ہیں مگر اسے مسجد ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ چودھری صاحب نے کہا کہ یہی بات تو مسلمان بھی کہتے ہیں۔ صلح کے جو بھی

شرائط ہوں سب منظور مگر وہ عمارت مسجد ہی ہے۔ کچھ دیر گفت وشنید کے بعد یہ طئے ہوا کہ ہم لوگ آج رات پھر اس مسئلے پر غور کریں۔ اور کل پھر ہم لوگ ملیں گے۔

رات بھر شمس سوچتے رہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں غصے میں بھرے پڑے ہیں۔ اس لڑائی اور دنگے کی جڑ یہی شکستہ عمارت ہے۔ جس میں آج تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے۔ ان کے ذہن میں مسجد ضرار کا واقعہ یک بیک کوند گیا۔ حضور کی موجودگی میں چند منافقوں نے ایک مسجد بنائی تھی۔ اور حضور سے التجا کی تھی کہ آپ چل کر انمیں نماز پڑھ لیں۔ رحمت عالم تیار بھی ہو گئے۔ مگر چند قدم بڑھے ہی تھے کہ وحی آنی شروع ہو گئی اور انہوں نے مسجد کو جلا دینے کا حکم صادر کیا۔ تب شمس کے دماغ میں بات آئی کہ یہ عمارت نہ مسجد ہے نہ مندر۔ اور پھر انہوں نے ایک چار نکاتی منصوبہ تیار کیا۔ جس کا حامل تھا آپسی اتفاق سے یہ عمارت خواہ مسجد ہو خواہ مندر مگر فریقین کی نگاہ میں ایک متبرک جگہ ضرور ہے۔ اسے ناپاکیوں اور گندگی سے محفوظ رکھنے کے لئے پختہ چہار دیواری سے گھیر وادیا جائے۔ اس عمارت سے متصل جو خالی زمین ہے وہاں ایک لائبریری بنائی جائے جس کا نام ہو اتحاد پستکالیہ جس کا صدر ایک سال مسلم اور ایک سال سکریٹری ہندو اور دوسرے سال اس کے برعکس اور ممبران دونوں فریقین سے برابر لیے جائیں۔ اس پستکالیہ کو چلانے کے لئے کرائے کی دکانیں بنادی جائیں اور جو مقدمات کچہری میں ہیں، صلح نامہ داخل کر دیا جائے۔ دوسرے دن شمس نے میٹنگ میں اپنا مشورہ سنایا سبھی نے بہ اتفاق رائے اسے تسلیم کرلیا مگر چودھری صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ دوسرے دن شہر کے تمام مسلمان شمس کو گالیاں دے رہے تھے۔ انہیں دہریہ، ظالم، کافر وغیرہ لفظوں سے نوازنے لگے۔

کورٹ میں پرانے ضابطۂ فوجداری کے باب اٹھارہ کے تحت انکوائیری ہوئی اور کیس شیسن کے سپرد کردیے گئے۔ اس دن پھر تمام حضرات جیل خانے بھیج دیے گئے۔ تیسرے دن ضمانت ہوگئی۔ پھر شمس اور کھوکھا بابو صلح ومصالحت کے لئے تگ ودو کرنے لگے۔ کبھی ہندوؤں کے پاس تو کبھی مسلمانوں کے پاس جاتے۔ آخر کار دونوں

فریقین اس بات پر متفق ہو گئے کہ پورنیہ سے ایک ہندو اور ایک مسلم وکیل بلایا جائے۔ان کے فیصلے کو ہم لوگ مان لیں گے۔جناب مجیب صاحب اور شری ست کوری بابو بلائے گئے۔دونوں حضرات نے تمام لوگوں سے صلح نامے پر دستخط لیا اور کہا کہ دودنوں کے بعد ڈرافٹ آپ لوگوں تک پہنچ جائے گا۔شمس کو اس سلسلے سے بھیج دیجئے گا۔جب ٹائپ شدہ صلح نامہ شہر میں پہنچا تو ایک بار پھر شمس کو برا بھلا کہا جانے لگا کیونکہ کچھ ترمیم وتنسیخ کے بعد فیصلہ وہی تھا جو شمس نے میٹنگ میں پیش کیا تھا۔چونکہ فریقین زبان ہار چکے تھے اس لئے انہیں شرائط پر دونوں مقدموں میں صلح نامہ داخل کر دیا گیا۔مگر اس صلح نے شمس کے لئے پریشانیوں کا ایک نیا باب کھول دیا۔شہر کے تمام مسلمان شمس سے بدظن ہو گئے۔ان کا شوشل بائیکاٹ کر دیا گیا۔چند ناراض وکلا،اوران کارندوں نے بھی ایک میٹنگ بلائی اور سب نے قسمیں کھائیں کہ کل سے شمس سے کسی قسم کا پیشہ ورانہ واسطہ وسروکار نہیں رکھیں گے۔صرف منشی معین الدین نے احتجاج کیا۔اور کہا کسی کی روزی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے پھر وہ اس نشست سے اُٹھ کر چلے گئے۔اس کی خبر جب شمس کو ملی تو گنگنااُٹھے۔

رزق راروزی رساں پر می دہد
بے مگس ہرگز نہ باشد عنکبوت

اسی وقت مختار محی الدین نے شمس کی طرف ایک درخواست مع وکالت نامہ بڑھایااور کہا کہ اس پر دستخط کرو اس مقدمے میں تم بھی رہو گے۔شمس نے خدا کا شکریہ ادا کیا۔

اس واقعہ نے شمس پر ایک گہرا اثر ڈالا۔مگر اس کے بعد ہی ان کی پریکٹس ایسے زوروں پر چل نکلی کے بڑے بڑے وکیل ان سے مات کھانے لگے۔

★★★

سیاسی

زمانۂ طالب علمی سے ہی شمس مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی اور پروفیسر عبدالباری کے بہت بھکت تھے سنہ ۱۹۳۰ء میں جب ایک کانگریسی نیتانے ولایتی کپڑوں کے جلانے کا اعلان کیا تو وہ ایک طفل معصوم ہونے کے باوجود گھر گھر جا کر لوگوں سے ولایتی کپڑا مانگ کر لانے اور ایک بڑ کے درخت تلے (یہ درخت اسکولی احاطہ کے نزدیک ہی اُتر پورب گوشہ پر ہے) جمع کرنے لگے اور جب کافی کپڑے جمع ہو گئے تو اسی نیتا نے ان کپڑوں میں آگ لگا دی۔ اسی زمانہ کا یہ دلچسپ واقعہ ہے کہ یہ جب مکان گئے تو بہن کی ساڑی بکس سے چرالی تھی۔

اسی زمانہ میں پروفیسر عبدالباری صاحب راج محل آئے تھے۔ اور اسکولی کمپاؤنڈ میں انہوں نے لوگوں کو مخاطب کیا تھا۔

۱۹۳۶ء میں جب خان عبدالغفار خان راج محل آئے تھے تو انکے جلسہ کو کامیاب بنانے کے لئے کافی سرگرم عمل رہے تھے اور جب معلوم ہوا کہ آئندہ انتخاب ہونے والا ہے تو یہ کانگریس کی طرف سے گھر گھر جا کر پرچار کیا کرتے تھے۔

۱۹۴۲ء میں Quit India اعلانیہ کے بعد ہر وہ کام انہوں نے کئے جو اس وقت کے جوشیلے نوجوان کررہے تھے۔ مگر چار یا پانچ دنوں ہی کے بعد انگریزوں نے وہ مظالم شروع کئے کہ وہ روپوش ہو گئے اور پھر ایسی زندگی گزارنے لگے کہ ان پر کسی کو کسی قسم کا شبہ نہ ہوا۔

۱۹۴۶ء مین کشن گنج میں صوبائی مسلم لیگ کا جلسہ ہوا جس میں ہندوستان کے چوٹی کے لیگی رہنما تشریف لائے تھے۔ جن میں جناب عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خاں، اور بہار کے صوبائی صدر جناب جعفر امام شامل تھے۔ ان حضرات نے بڑی پُر جوش

تقریریں کیں۔ مسلمان سب کے سب لیگ کے حمایتی بن گئے۔ جعفر امام نے یہ یقین دلایا تھا کہ پورنیہ ضلع بھی پاکستان میں شریک ہو جائے گا۔ اس وقت ہندوستان کا نقشہ جو لیگی حضرات بانٹ رہے تھے اسمیں آسام، بنگال اور بنگال سے ملحق پورنیہ ضلع بھی سبز رنگ میں دکھلایا گیا تھا۔ دوسرے سال کشن گنج کے لیڈروں نے ایک وفد قائد اعظم سے ملنے کیلئے بھیجا۔ وہاں سے وفد نے آکر کہا کہ پورنیہ ضلع پاکستان میں شامل کر لیا جائے گا۔ اس کا مقدمہ لے کر ایک وفد کو کلکتہ جانا چاہئے۔ اس وقت Facts and Figurs Finding کے سکریٹری جناب زبیری صاحب تھے اور لکھنؤ سے ایک وکیل آئے تھے جنکا نام شاید وسیم صاحب تھا۔ ان دونوں کے پاس کشن گنج سے ایک وفد Facts and Figurs لے کر جانا تھا۔ یہ جون ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس وقت بھی کلکتہ میں ہندو مسلم دنگا شانت نہ ہوا تھا۔ اکا دکا قتل کی واردات اخباروں میں شائع ہو رہی تھی۔ یہاں کہ مجلس عاملہ کی نظر شمس پر پڑی اور پھر یہ حاجی عبدالغفار صاحب اور وکیل نظیر الاسلام صاحب کے ساتھ Facts andFigurs سے لیس ہو کر کلکتہ گئے۔ دو روز کے بعد حاجی صاحب اور وکیل صاحب شمس کو وہاں تنہا چھوڑ کر واپس آ گئے۔ وہ سب سے پہلے اپنے ایک کلکتوی دوست کے ساتھ مارننگ نیوز انگلش ڈیلی (Morning News English Daily) کے دفتر میں گئے اور چیف ایڈیٹر سے ملاقات کی اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ دوسرے روز مارننگ نیوز میں انکے آنے کے مقصد وغرض کی خبر شائع ہوگئی۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے لیڈران خود ان سے ملنے کے مشتاق رہنے لگے۔

ایک دن یہ جناب فضل الحق صاحب جو سابق چیف منسٹر آف بنگال تھے کے یہاں گئے۔ وہ اس وقت ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے تھے۔ چونکہ مسلم لیگ نے انہیں نکال دیا تھا۔ پہلے تو وہ انہیں بنگالی سمجھ بیٹھے اور بنگلہ زبان میں گفتگو کا آغاز کیا۔ مگر جب

شمس اردو بولنے لگے تو موصوف بھی نہایت شستہ اردو میں بات کرنے لگے۔ اسطرح یہ بجز سہروردی کے سب بڑے بڑے لیڈروں سے ملتے رہے اور اپنے کیس کی وکالت کرتے رہے۔ مولانا اکرم خان نے ان سے کہا کہ آپ وسیم صاحب سے اب تک کیوں نہیں ملے وہ فلاں جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان سے مل لیجئے یہ بھاگے بھاگے وہاں گئے مگر ان سے گفتگو کرنے کے بعد بڑی مایوسی ہوئی جب انہوں نے کہا کہ پورنیہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو مجھ سے کسی نے نہیں کہا اور نہ میرے بریف میں ہے کہ پورنیہ بھی ایڈکلف کمیشن کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ مگر انکے جونیر نے کہا کہ حضور ہم پورنیہ کے کیس کا ایک ڈرافٹ بنا دیتے ہیں اسے بھی آپ پیش کر دیجئے۔ اور انہوں نے ایک مسودہ تیار کر دیا جسے شمس صاحب نے ٹائپ کرا کر تین کاپیاں وسیم صاحب کے حوالے کر دیں۔ مگر سب سے زیادہ افسوس انہیں یہ ہوا کہ جب سماعت کے موقع پر اجلاس میں شریک ہونے کا اجازت نامہ نہیں ملا۔ سنوائی وائسر یگل عمارت میں ہو رہی تھی۔ ایڈکلف آ چکے تھے شمس صاحب اس عمارت کے گیٹ تک گئے مگر وہاں ایک سکھ پہریدار نے روک لیا مگر اس جگہ ایک پنجابی پٹھان بھی گیٹ پر تھا اس نے کہا کہ اسکو جانے دو اور اسطرح شمس صاحب پچھلے دروازہ سے اس اجلاس میں شریک ہو گئے اور بڑے نامی گرامی وکیلوں کی بحثیں سنیں مگر پورنیہ کا تذکرہ کہیں نہیں آیا۔ یہ کلکتہ میں دو[۲] تین روز اور ٹھہرے جب تک رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا۔

تین چار دن رہنے کے بعد انہوں نے اپنے کمر ہٹی کے مزدور دوست ابوالبرکات کو خبر دی۔ وہ آئے اور انہیں لے کر کمر ہٹی چلے گئے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آزادی کا اعلان ہوتے ہی دوسری صبح کو جتنے کٹر لیگی تھے بیک دم کانگریسی بن گئے۔ اور سب سے پہلے جعفر امام کانگریسی بنے مگر شمس نے پھر کانگریس کا نام نہیں لیا اور آج تک لاکھ ترغیب و تحریص کے باوجود انہوں نے کانگریس کی طرف دیکھنا تک گوارہ

نہیں کیا۔انکی لغت میں کانگریس ایک بدنما لفظ بن کر رہ گیا۔جس کو آگے چل کر کانگریسیوں نے اپنے حرکات،اعمال اور افعال سے ثابت کردیا کہ کانگریس اب وہ جماعت نہیں رہ گئی جس میں کوئی سوجھ بوجھ والا آدمی شریک ہو سکے۔۱۹۷۲ء کے الیکشن کی بات ہے کہ ایک سنگ کانگریسی M.P. جناب یوسف صاحب آف سیوان نے شمس کے آفس میں آکر کہا کہ تم کشن گنج حلقہ سے M.P. کیلئے کھڑے ہو جاؤ۔اس وقت اندرا گاندھی کا بول بالا تھا اگر یہ کھڑے ہوتے تو یقینی کامیابی سے ہم کنار ہو جاتے مگر انہوں نے صاف انکار کردیا کہ کانگریس کی ٹکٹ پر الیکشن لڑنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔

۱۹۴۸ء کی ۳۰ جنوری کو ایک بدقماش سرپھرے نے گاندھی جی کا قتل کردیا۔سوسلسٹ پارٹی جو اس وقت کانگریس ہی کے اندر تھی اور گرم دل کے نام سے مشہور تھی کانگریس اور کانگریسی سرکار سے بدظن ہوگئی اور اس نے سارا الزام کانگریسی سرکار کے سر لگایا کہ راشٹر پتا کے قتل میں وہ بھی ماخوذ ہے۔اور پھر ناسک میں سوسلسٹ پارٹی کی ایک ریلی ہوئی جس میں یوسف،مہرعلی،اچاریہ نریندر دیو جی،ابوالحیات چاند، مسز لوہیا،اشوک مہتہ،شری راجپوت پوردھن وغیرہ شریک تھے۔شری جے پرکاش بھی اس ریلی میں موجود تھے۔ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے سوسلسٹ ممبر،حامی اور ورکر اس ریلی میں پہنچے اور وہاں یہ طئے پایا کہ سوسلسٹ پارٹی اپنی ایک الگ تنظیم قائم کرے اور کانگریس کے بالمقابل تنظیم قائم کرے۔اس ریلی میں پورنیہ ضلع سے شری دیونا تھ رائے،نرسنگھ نرائن سنگھ اور ڈاکٹر کالد یپ جہا بھی شریک ہوئے تھے۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں سوسلسٹ پارٹی کی بنیاد کشن گنج میں ڈالی گئی۔سورج نرائن تھیرانی کے دارالکدہ پر بیٹھک ہوئی اس میں شمس صاحب بھی شریک تھے اور اس میٹی کا سب سے پہلے ممبر شمس ہوئے اور پھر دوسرے حضرات بھی شامل ہو گئے۔

کشن گنج دھرم شالہ میں پارٹی آفس کا قیام ہوا۔ایک کمرہ آفس کیلئے تھیرانی جی

نے خالی کروادیا۔ ڈاکٹر کلد یپ جھا پارٹی ورک کیلئے کشن گنج میں چھوڑ دیے گئے۔ اور پھر پارٹی کی تنظیم کے سلسلہ سے شمس پورنیہ ضلع کے قریب قریب سارے مشہور علاقہ میں اکثریت جو مسلمانوں کی ہے ان کے ذہن میں یہ خیال ڈال دیا گیا کہ سوسلسٹ پارٹی دہریوں کی جماعت ہے یہ پارٹی خدا کی وجود کی منکر ہے۔ اب مسلمانوں کو اس پارٹی میں لانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مگر سال بھر کی محنت نے یہ ثمرہ دیا کہ کشن گنج کے زیادہ تر گاؤں میں سوسلسٹ پارٹی کی آفس قائم ہوگئی اور نوجوان طبقہ اس پارٹی کا ہم نوا بن گیا۔ پھر تو کسانوں اور مزدوروں کا ایک ریلہ تھا کہ اس پارٹی کی طرف آتا چلا گیا۔ کانگریس کی جماعت نے اسکی بڑی شدت سے مخالفت کی خصوصاً جمیعت العلماء کے مولوی بڑی شدومد سے اس پارٹی کے خلاف آوازیں اُٹھانے لگے۔ اس وقت تک زمینداری کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ زمینداروں نے بھی اس پارٹی کی سخت مخالفت کی۔ مگر شمس سب کا مقابلہ کرتے رہے اور یہ پارٹی آگے بڑھتی رہی۔

۱۹۴۹ء میں خبر آئی کہ پٹنہ میں آل انڈیا سوسلسٹ کنونشن ہونے والا ہے۔ اسکی صدارت یوسف مہر علی کریں گے۔ اسی سلسلہ میں جئے پرکاش نارائن نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور وہ کشن گنج بھی تشریف لائے۔ کشن گنج Camping Ground میں جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت شمس صاحب کو سونپی گئی۔ اور وہ جلسہ انہیں کی صدارت میں ہوا۔ J.P. کی تقریر کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اور بہت سے مسلمان جواب تک اس پارٹی کے نام سے بھڑکتے تھے رفتہ رفتہ اس پارٹی کے پرچم تلے آتے گئے۔

پٹنہ کنونشن میں بھی شمس صاحب اپنے کشن گنج کے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہوئے۔ ڈاکٹر کلد یپ جھا پہلے ہی روانہ ہو گئے تھے۔ اس جلسہ میں یوسف مہر علی صاحب نہیں آسکے اور وہ عظیم الشان جلسہ اچاریہ نریندر دیو کی صدارت میں ہوا۔ اس موقع پر

پہلے پہل شمس نے ان قدآور لیڈروں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور رامانند مشر (دربھنگہ) شمس کی باتوں سے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آپ اگر چاہیں تو جمشید پور جاکر ریاست کریم صاحب کے ماتحت مزدوروں میں کام کریں۔ شمس صاحب راضی ہو گئے اور کشن گنج آکر جمشید پور جانے کی تیاری کرنے لگے مگر عین اس وقت جب یہ اپنا بستر اور سوٹ کیس لے کر اپنے کمرے سے نکلنے والے ہی تھے کہ انکے ایک دوست آ گئے اور انہوں نے انکی کمر دونوں ہاتھ سے پکڑی اور کہا خدا کے واسطے اس ارادے کو ترک کرو۔ اس میدان میں لوگ صرف جھولی ڈھوتے ہی رہ جاتے ہیں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ تم کو پارٹی سے اتنی ہی محبت ہے تو کشن گنج ہی میں کام کرو۔ آخر تمہاری زندگی میں تمہاری ایک بیوی بھی ہے اور چند روز ہوئے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی ہے۔ شمس نے بھی بستر کھول دیا اور کہا خیر اب میں وہاں نہیں جاؤنگا۔ اس وقت انکی بیگم میمونہ خاتون اپنے میکے مینہاری کٹیہار میں تھیں اور ایک ہفتہ قبل ہی خط آیا تھا کہ ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ انہوں نے پٹنہ اور جمشید پور خط لکھ دیا کہ ابھی میں جمشید پور جانے سے معذور ہوں۔

شمس کے دل میں دیہاتوں میں کام کرنے کے علاوہ پبلیسٹی کا لٹریری ڈپارٹمنٹ بھی تھا۔ پورنیہ سے رینو جی ہفتہ وار اخبار "نئی دشا" نکال رہے تھے اور شمس صاحب "آئینہ" اخبار کو سوشلسٹ پارٹی کے آرگن کی حیثیت سے استعمال کر رہے تھے۔ جو اخبار آزادی سے قبل مسلم لیگ کا حامی تھا اب وہ سوشلسٹ پارٹی کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالنے لگا۔ اس دوران انہوں نے پارٹی کی حمایت میں بہترین اداریے سپرد قلم کئے اور جب یہ اخبار پٹنہ پارٹی آفس میں پہنچتا تھا تو وہاں کے ممبران بڑی دلچسپی سے اسکا مطالعہ کرتے تھے۔ انکے اداریوں نے پٹنہ کے ممبروں کو اتنا متاثر کیا کہ پٹنہ آفس نے دو ۲ مشہور پارٹی ورکر جو پورے بہار لیڈر کی حیثیت ابھر رہے تھے اور جنکی رہنمائی ابوالحیات چاند کر رہے تھے کشن گنج بھیجا۔ انکا نام تھا احد فاطمی اور قیوم تمنا۔ یہ دونوں

حضرات کشن گنج آئے اور شمس سے بہت سے مسئلوں پر تبادلۂ خیال کیا۔اس وقت تک شمس صاحب دو۲ چھوٹے چھوٹے کتابچہ شائع کر چکے تھے۔ایک کا نام تھا'' دو۲ سوال''اور دوسرے کا نام تھا''مسلمان کیا کریں۔''

''دو۲ سوال'' مکالموں کی صورت میں تھا۔اسمیں ایک جگہ انہوں نے لکھا تھا کہ اے مسلمانوں تم اگر سوسلسٹ پارٹی کے ممبر نہ ہوئے تو یا در کھو سڑکوں پر تمہاری لاشیں کتے بلّیوں کی سی پڑی نظر آئیں گی۔اس جملہ پر مقامی علماء کرام نے بہت بڑا احتجاج کیا اس وقت شری ٹنڈن جی کانگریس کے صدر تھے اور ایسی ہندی کا پرچار کرر ہے تھے جسے اچھے اچھے ہندی داں بھی سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔اسکی طرف بھی شمس صاحب نے انگشت نمائی کی تھی اور کہا تھا کہ اگر یہی حال کانگریس کا رہا تو کل تمہاری زبان ہمیشہ کیلئے موت کے گھاٹ اُتار دی جائے گی اور پھر تمہارا کلچر تمہارا کلچر نہ رہے گا۔اس جملہ پر یہاں کے ہندو حضرات نے شمس کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا اور کہا اسکے قلم سے اب تک مسلم لیگ کی بُو آرہی ہے۔اس نے صرف سوسلسٹ ہونے کا ڈھونگ رچ لیا ہے۔ہندوؤں کو جواب دینے ڈاکٹر کلدیپ جھا،رمیش چندر سابا اور ڈاکٹر جنے مترا کافی تھے۔ان تینوں نے وہ دندان شکن جواب دئے کہ کانگریسیوں کی گھگھی بندھ گئی۔

۱۹۵۰ء میں نیپال کے اندر جنگ آزادی چھڑ گئی۔بی۔پی کوریلا کی قیادت میں وہاں کے نیپالی نوجوان نیپالی وزیروں کی حکومت کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکنے کیلئے پاگل ہو گئے۔یہ اس ملک کی بدقسمتی تھی کہ راجہ صرف نام کا راجہ ہوتا تھا اور حقیقت میں حکومت وزیراعظم کی ہوتی تھی جسکے مظالم اور اتیا چار سے نیپالی جنتا کراہ رہی تھی۔ہر گھر سے آہ وفغاں کے دھوئیں بلند ہو رہے تھے۔ہندوستان کی سوسلسٹ پارٹی نے کوریلا کی مدد کا بیڑہ اُٹھایا۔کوریلا کے چھوٹے بھائی کشن گنج آئے اور شمس سے ملاقات کی یہ ملاقات بہت پوشیدہ رہی۔بھولا بابو نام کے ایک ساتھی کے گھر میں وہ ٹھہرے

تھے۔ وہیں رمیش جی شمس کو بُلا کر لے گئے۔ وہیں پروگرام طئے ہوا کہ کس طرح Arm and Ammunition کی سپلائی نیپال کی جائیگی اور کس طرح یہ سامان کلکتہ سے کشن گنج منگوائے جائینگے۔ پورے پروگرام کو شمس اور رمیش جی نے اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی اور کسی شخص کو شمس پر کسی طرح کا شُبہ نہ ہوا۔ ساتھی یوُوراج سنگھ (جو ابھی حیات سے ہیں اور سٹنگ .M.P ہیں جنتا پارٹی کے) بھی کشن گنج آکر اس کام میں شریک ہو گئے تھے اور انہیں کے ذمہ داری ان چیزوں کو نیپال تک پہنچانی تھی۔ ڈاکٹر کلد یپ جھا پہلے ہی نیپال جا چکے تھے اور وہ باضابطہ طور پر کوریلا کی طرف سے مورچہ سنبھالے ہوئے تھے۔

۲۶ دسمبر ۱۹۵۰ء کو یہ دردناک خبر آئی کہ ڈاکٹر کلد یپ جھا شہید ہو گئے۔ رائفل کی ایک گولی نے انکا کام ۲۵ دسمبر کو تمام کر دیا یہ وہ تاریخ ہے جس تاریخ کو دنیا کا ایک بہت بڑا پیغمبر امن وشانتی کے دوت نے یروشلم میں جنم لیا تھا اور اسی تاریخ کو ڈاکٹر کلد یپ جھا جیسا مرنجان مرنج شخص شہید ہو گیا۔ شمس اور رمیش نے ۲۶ تاریخ کو کشن گنج والوں سے اپیل کی کہ آج ڈاکٹر کلد یپ کی شہادت کی سوگ میں اپنی دکانیں بند رکھیں اور کشن گنج میں اس روز ساری دکانیں آنافاناً بند ہو گئیں۔

ڈاکٹر کلد یپ کے مرتے ہی شمس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بہت کم آفس جانے لگے۔ رفتہ رفتہ اپنی ساری ذمہ داریاں دوسروں کو سونپنے لگے۔ اسی درمیان لکھن لال کپور کشن گنج آئے اور سوسلسٹ پارٹی آفس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ انکے اندر تنظیمی صلاحیت تھی اور وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے مگر ان میں ایک سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ یہ ضرورت سے زیادہ خود بیں، مغرور اور خوشامد پسند تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص سے شمس کا بناؤ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے شمس نے آفس جانا ہی ترک کر دیا۔ ایک معمولی ممبر بن کر رہ گئے اور اب یہ اپنا سارا وقت اپنے پیشہ وکالت کی طرف دینے لگے۔ اسی عرصہ میں ان

کے دو ناول ''نذرانہ'' اور ''اور سالگرہ آتی رہی'' شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں انکے سیاسی رجحان اور عقیدے کی غماز ہیں۔

۱۹۵۷ء میں پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ .M.L.A چناؤ میں ہر سیٹ پر کانگریس کے مقابلہ میں اپنا نمائندہ کھڑا کرے۔ کشن گنج سیٹ کیلئے کوئی کام کا آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ بہت چھان بین کرنے کے بعد شمس اور لکھن جی نے گنجر یا کے ایک شخص کو تیار کیا۔ وہ غریب راضی بھی ہو گیا اور اسکی طرف سے پرچار کا کام شمس صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا۔ ایک دفعہ پھر انکے اندر وہی سرگرمی آگئی دیہات دیہات جا کر اپنے نمائندہ کے حق میں فضا ساز گار کرنے لگے۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پارٹی امیدوار یقینی کامیاب ہو جائیگا۔ شمس میں خوبی تھی کہ وہ کسی سے بحث ومباحثہ میں نہیں اُلجھتے مگر اپنی باتوں کو کچھ اس انداز اور پُر اثر منطقی ڈھنگ سے پیش کرتے تھے کہ سننے والا انکے خیال سے متفق ہو کر ہی اُٹھتا تھا۔

کانگریس کا نمائندہ جو کشن گنج حلقہ سے کھڑا ہونے والا تھا وہ تھے جناب ابوالحیات وکیل (خاں صاحب) ان سے اور گنجر یا کے میاں زاہد الرحمٰن سے بڑی دوستی تھی اور یہ سوسلسٹ نمائندہ خشیع الرحمٰن کے اپنے چچا ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے پر ناجائز دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ نامزدگی کے ٹھیک ایک ہفتہ قبل خشیع الرحمٰن نے سوسلسٹ ٹکٹ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اب تو سب کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ہر ممبر دم بخود اب کیا کیا جائے؟ پورنیہ، فاربسگنج اور ارریہ کے ساتھی دوڑے دوڑے کشن گنج آئے اور پارٹی آفس میں رائے مشورہ ہونے لگا۔ آخر یہ طئے ہوا کہ الیکشن تو لڑنا ہی ہے کیوں نہیں ہم لوگ شمس ہی کو ٹکٹ دیدیں اور اخراجات کے انتظام پارٹی برداشت کرے۔ قبل اسکے کہ شمس صاحب کچھ کہتے نرسنگھ نرائن سنگھ نے اپنا ہاتھ انکے منہ پر رکھ دیا۔ اور پھر شمس صاحب انتخاب لڑنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

کانگریس نے اپنی پوری طاقت شمس کو ہرانے میں لگا دی ادھر پارٹی کے نوجوان بھی اپنا کھاپی کر شمس کی حمایت میں دیہات دیہات پھیل گئے اور خاص خاص جگہوں پر میٹنگ کا انتظام ہونے لگا۔ جہاں شمس جاتے عوام سے سوشلسٹ پارٹی کو کامیاب کرنے کیلئے اپیل کرتے۔ جنگ تو خوب جم کر ہوئی مگر شمس چار ہزار ووٹ سے ہار گئے۔ شمس نے اپنی ہار کی خوشی میں جشن منایا اور اپنے خاص خاص دوستوں سے کہا کہ بھئی ایک مرتبہ پھر خدا نے مجھے گڑھے میں گرنے سے بچالیا ہے۔ اسی شام پھول کا ایک ہار لے کر خاں صاحب کے یہاں گئے اور انکے گلے میں پہنا دیا۔ انکے اس برتاؤ کو دیکھ کر کانگریسی حمایتیوں نے کہا کہ عجیب مسخرہ لڑکا ہے۔

۱۹۵۹ء میں کشن گنج میں ایک ہندو مسلم فساد ہو گیا تھا۔ جسمیں شمس صاحب بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ مقدمہ تو صلح ہو گیا اور سب کے سب جیل جانے سے بچ گئے مگر اس واقعہ نے شمس صاحب کے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا اور اب یہ ہر قسم کی Activity سے الگ تھلگ رہنے لگے۔ اب انکا کام صرف کچہری جانا رہ گیا اور فرصت کے اوقات مطالعہ میں غرق رہنے لگے۔

مذہبی

انکے گھر کا ماحول کٹر مذہبی تھا۔ بچپن میں یہ ورثہ میں ملے عقیدوں پر سختی سے قائم تھے۔ مگر عمر و مطالعے کے ساتھ ان میں تبدیلی آ گئی ۱۹۴۴ء سے انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ آخر مسلمان اتنے فرقوں میں کیوں بٹے ہوئے ہیں؟ غور و فکر سے معلوم ہوا کہ ایمان کے تعلق سے سارے مسلمان متفق ہیں۔ لیکن تنگ نظری کے باعث عقیدے ایمان پر حاوی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے مسلمانوں کا عقیدہ ایک ہی ہو۔ پھر مجتہدوں نے فقہ کی تشریح و تبلیغ اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ اور انہیں فقہی اختلاف کو ہم مسلمانوں نے ایمان کا درجہ دے رکھا ہے۔ ہم یہ سمجھنے لگے کہ اسلام میں جتنے ضروری کام تھے صدیوں پہلے وہ ہمارے اسلاف اور مجتہدوں نے انجام دے دئے۔ اب قرآن و حدیث میں غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں حالانکہ قرآن جا بہ جا ہمیں غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم قرآن کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس پر غور و فکر کی زحمت نہیں کرتے۔ مثلاً ہمارا ایمان ہے کہ اللہ نے دنیا کے ہر خطہ اور قوم میں اپنا رسول و پیغمبر بھیجا ہے۔ اپنی کتابیں اور صحیفے نازل کئے ہیں۔ اس پر ایمان رکھنے کے باوجود ہم مسلمان یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ ہندوستان میں بھی کوئی نبی، رسول، ہادی اللہ نے یہاں بھیجا ہو۔ ایک طرف ہم یہ مانتے ہیں کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ دوسری طرف یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ ان ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہندوستان کے مذہبی رہنما، کرشن جی، رام جی، بدھ جی یا جین جی کوئی خدا کے فرستادہ ہو سکتے ہیں۔

مسلمان عام طور پر انہیں ہی نبی یا رسول سمجھتے ہیں جن کا تذکرہ قرآن پاک میں آیا ہے۔ حالانکہ قرآن شریف میں چند اسرائیلی نبیوں کے نام ہیں اور پانچ چھ نام ایسے ہیں جو غیر اسرائیلی ہیں۔ نبیوں کے علاوہ اللہ کی کتابوں کے متعلق بھی مسلمانوں کا عقیدہ

ہے کہ اللہ کی کتابیں صرف چار ہیں توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید۔ اب اگر ان سے اقوال کنفیوشش، زرتست کی کتاب ''اوستا'' یا ویدمقدس کے بارے میں کہا جائے کہ یہ بھی خدا کی کتابیں ہیں تو مسلمان انہیں ماننے پر ہرگز تیار نہیں ہونگے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور کلام اللہ کو مسلمان نے ہم معنی لفظ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ کلام اللہ صرف قرآن پاک ہے اور کتاب اللہ باقی دوسری کتابیں ہیں۔ کتاب اللہ کے معنی مختصر لفظوں میں یہ ہیں کہ جو نبی اپنی قوم کی ہدایت کیلئے آئے انہوں نے خدا کی نگرانی میں اور اسکی منشاء کے مطابق کچھ قوانین وضع کئے اور جب یہ قوانین یکجا جمع کر دئے گئے تب یہ کتاب اللہ ہو گئے۔ یعنی مضمون تو خدا کا تھا اور الفاظ اس مخصوص نبی کے۔ ہندوستان، ایران اور چین میں بہت سے مذہبی رہنما اپنی قوم کی ہدایت کیلئے آئے۔ ان اقوام کے پاس اپنی تہذیب اور اپنی کتابیں ہیں عبادت کے طریقے ہیں، معاشرت کے قوانین ہیں تو پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جن رہنماؤں کو ان لوگوں نے اپنا پیشوا قرار دے رکھا ہے اور فرطِ محبت سے انہیں خدا کا درجہ بخش دیا ہے، انہیں ہم نبی یا رسول نہیں کہہ سکتے۔ آخری نبی اور رسول کے مبعوث ہونے کا مقصد کیا ہے؟ مقصد صرف اپنی قوم کی ہدایت ہے۔ تاریکی جب حد سے گزر جاتی ہے تو اسے دور کرنے کے لئے ایک مشعل بردار کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ روشنی دکھانے والی اسی ہستی کو ہم نبی یا رسول کہتے ہیں۔ ہندوستان والے اسے اوتار، رشی اور مُنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے نام آئے جن کا تذکرہ موقع محل کو دیکھتے ہوئے اللہ نے ضروری سمجھا۔ اس خیال نے شمس صاحب کے عقیدے میں سب سے پہلے ضرب پہنچائی اور وہ اس جستجو میں لگ گئے کہ ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید میں ہندوستان کے نبیوں کے نام ہوں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ جو نام قرآن مجید میں آئے اس نبی کا وہی نام دوسرے ملک میں نہ ہو۔ مثلاً یونس کو جونا کہا گیا، داؤد کو انگریزی میں DAVID، عیسیٰ کو JESUS، مریم کو میری موسیٰ کو موسیس کہا گیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس موسیٰ کو ہندوستان والے کسی دوسرے نام سے منسوب کرتے

ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ کرشن جی کا نام مہا تما بدھ کا نام قرآن پاک میں کوئی دوسرا ہو۔ یہ ہم طالب علموں کا فرض ہے کہ اسکی چھان بین کریں۔

بہت غور وخوض کے بعد شمس صاحب اس فیصلہ پر پہنچے کہ حضرت موسیٰ اور شری کرشن ایک ہی نبی کے دو نام ہیں۔ مہا تما بدھ کو قرآن میں ''ذوالکفل'' کہا ہے۔ یہ صرف انکا حسن ظن ہی نہیں۔ بلکہ انکے تحقیقی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

قرآن پاک میں کچھ نبیوں کو واقعہ جگہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ جیسے یونس کو ''ذوالنون'' یعنی مچھلی والے غار میں سونے والے چند اللہ والوں کو ''ذوالکہ'' اور ایک کو ''ذوالقرنین'' کہا گیا۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ ''ذوالکفل'' کون ہے؟ ذوالکفل کا تذکرہ حضرت اسمٰعیل کے ساتھ آتا ہے۔ اس صفت کے ساتھ کہ یہ سب صابروں میں سے تھے۔ لفظ ''صبر'' پر اگر ہم غور کریں تو یہ لفظ اَہنسا اور ستیہ کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیتا ہے۔ بہت سے لفظ جنہیں عربوں نے اپنایا۔ ان الفاظ کے وہ حرف جو عربی میں نہیں ہے ہیں۔ انہیں عربوں نے اپنے مروج حرفوں میں تبدیل کر دیا۔ مثلاً ''پیل'' کو عربوں نے ''فیل'' کہا عام طور سے ''پ'' عربی میں ''ف'' سے بدل جاتا ہے۔ ذوالکفل کے معنی ہوئے کفل والے۔ یہ کفل کپل کی عربی شکل ہے۔ ذوالکفل کسی اسرائیلی نبی کا نام ہے۔ یہ غیر اسرائیلی نبی ہیں اور یہ انکا ذاتی نہیں بلکہ صفاتی نام ہے۔ ہندوستان میں کپل والے کو کپل دیو بھی کہتے ہیں۔ کپل ایک شہر کا نام ہے۔ جہاں مہا تما بدھ پیدا ہوئے اور انہیں یہاں کپل دیو بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ستیہ اور اہنسا کی تعلیم بھی دی ہے۔

شمس کے اس خیال کی تائید دبی زبان سے مولانا فضل الرحمٰن بھی اپنی کتاب قصص القرآن میں کرتے ہیں۔ مگر وہی ایک غیر مرئی خوف انہیں پھر اس عقیدہ سے منحرف کر دیتا ہے۔

اس طرح اگر ہم موسیٰ اور شری کرشن کی پیدائش، جائے پیدائش معجزات اور طریقہ کار پر غور کریں تو اس میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ حضرت موسیٰ حقیقت میں کرشن

جی ہی کا دوسرا نام ہے۔ حال کی تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت کی قوم بارہ قبائل میں بٹ گئی تھی۔ اس میں قبیلہ گم ہوگیا۔ اس گم شدہ قبیلہ کا پتہ لگا کہ کشمیر میں آ کر ہندوؤں میں گھل مل گیا، اپنے بزرگوں کی کہانیاں یہاں والوں کو سنانے لگا اور یہاں والے یہ سمجھ بیٹھے کہ جس بزرگ ہستی کا تذکرہ یہ قبیلہ کر رہا ہے۔ اسکا وطن ہندوستان ہی ہے۔ حضرت موسیٰ کی ماں کا نام ''یوکید'' ہے اور شری کرشن کی ماں کا نام ''دیوکی'' ہے۔ ان دولفظوں پر غور کیجئے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ زمانے کے اُلٹ پھیر نے صرف ''د'' کو ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف ڈال دیا ہو۔ اگر یوکید کی دال شروع میں رکھ دی جائے تو یہ دیوکی بن جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی پیدائش کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ حاکم وقت فرعون کو راج پروہتوں نے کہا کہ ایک لڑکا جو پیدا ہونے والا ہے، وہ آپکی سلطنت کو ختم کردے گا۔ فرعون مصر کا خدا بن بیٹھا تھا اور مصریوں سے اپنے آپکو پوجواتا تھا۔ اس نے بہت سے معصوم بچوں کا قتل کروادیا۔ موسیٰ کو خدا نے بچالیا اور یہ موسیٰ فرعون کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔ ٹھیک یہی کہانی کرشن جی کی پیدائش کی بھی ہے۔ یہاں کنش خدائی کر رہا تھا اور اسے آکاش وانی ہوئی کہ دیوکی کا لڑکا تمہیں اور تمہاری حکومت کو ختم کردیگا۔ تو اس نے دیوکی کو قید کرلیا۔ اسکے سات بچوں کو پے در پے پتھر پر پٹک کر ماردیا۔ مگر آٹھویں لڑکے جو کرشن جی تھے۔ بچالیا گیا۔

گائے اور سانپ دونوں کی زندگی میں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ مدھوبن اور مدین دونوں کی جائے تفریح ہے۔ رعدہ اور رادھا دونوں کیلئے عشق حقیقی کا درجہ رکھتے ہیں۔ رعدہ کے معنی بجلی کی کڑک ہے اور مولانا حسن نظامی کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ رادھا کسی عورت کا نام نہیں بلکہ شری کرشن جی کے اندر کی وہ روشنی ہے جسے نور الٰہی کہتے ہیں۔ کرشن جی کی مُرلی وہی کام کرتی ہے جو حضرت موسیٰ کا عصا۔

حضرت موسیٰ کو ید بیضا کا معجزہ اور کرشن جی کا انگلی میں سدرشن چکر کا ہونا اس

بات کی دلیل ہے کہ دونوں ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور دونوں کا مصرف بھی ایک ہی تھا۔ کرشن جی کو گردھر بھی کہتے ہیں۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ مہاراج اندر نے اتنا پانی برسایا کہ گوکل ڈوب چلا۔ اس وقت کرشن جی نے ایک پہاڑ کی طرف اپنی بانسری سے اشارہ کیا۔ وہ پہاڑ زمین سے اوپر اٹھ کر ہوا میں معلق کھڑا ہو گیا اور اسی کے نیچے اہل گوکل پناہ گزیں ہوئے۔ اس معجزہ کا تذکرہ قرآن پاک میں بھی آتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے جسم کی رنگت وہی تھی جو کرشن جی کی تھی۔ کرشن جی بالکل کالے نہ تھے بلکہ شیام بدن تھے اور حضرت موسیٰ کے جسم کی رنگت کی نسبت سے آج بھی ایک مخصوص پتھر کو سنگ موسیٰ کہتے ہیں۔

ان دونوں پیغمبروں کے بارے میں شمس صاحب نے بہت سے مواد اکٹھے کر رکھے ہیں اور انکا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ ہی کو ہندوستان میں کرشن کہہ کر اپنا لیا گیا ہے۔ ہاں دونوں کی کہانیوں میں دونوں جماعتوں نے بہت سی من گھڑت کہانیاں بھی گڑھ رکھی ہیں۔ مصر سے آنے والے پنڈت، ہندوستان میں آ کر شری برہمن بن گئے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مسلمانوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوتے گئے اور ہر فرقہ نے صرف اپنے آپ کو ناجی سمجھا اور باقی کل فرقوں کو ناری قرار دیا اور کمال تو یہ ہے کہ ہر فرقہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو پیش نظر رکھا کہ میری امت میں بہتر فرقے ہونگے۔ ان میں صرف ایک فرقہ کو فرض کر رکھا ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ صرف مشرکوں کو نہ بخشے گا اور باقی جسے چاہے بخش دے۔ ان دونوں باتوں پر غور کرنے کے بعد شمس صاحب اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہم لوگوں نے امت کے معنی سمجھنے میں کچھ غلطی کی ہے۔ امت کے معنی ہم نے صرف مسلمانوں کو سمجھا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں امت کے لفظ پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قوم جسکی طرف کوئی نبی یا رسول مبعوث ہوتا ہے۔ اس شرح کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو قرآن کے اس اعلان کے مطابق کہ آپ

کہہ دیجئے کہ اے انسانوں میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضور کی امت وہ نہیں جو کلمہ پڑھتے ہیں۔ بلکہ قیامت تک آنے والا تمام بنی نوع انسان آپؐ کی امت ہے۔ اب قیامت تک آنے والے انسانوں میں جس نے بھی شرک نہیں کیا وہ ناجی ہے اور ظاہر ہے کہ مشرک بے شمار فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور جو مشرک نہیں اسے ہم صرف ایک گروہ میں الگ کر سکتے ہیں۔ اب گروہ میں جو بھی آجائے وہ ناجی ہوگا۔ خواہ مسلمان ہو خواہ غیر مسلم۔ شمس کے اس نظریہ کی تائید قرآن وحدیث دونوں سے ہوتی ہے۔ گرچہ مسلمان اسے جلد ماننے کیلئے تیار نہیں ہونگے۔ مگر شمس صاحب اپنے اس عقیدہ پر پوری مضبوطی اور دلیل کے ساتھ قائم ہیں۔ انہوں نے اپنے آپکو مسلمانوں کے کسی فرقہ سے وابستہ نہیں رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم مسلمانوں میں جتنے فرقے دیکھتے ہیں وہ فرقے نہیں بلکہ الگ الگ مکتبہ فکر کی ٹولیاں ہیں جس طرح سپریم کورٹ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر اسکے ماتحت بہت سے ہائی کورٹ ہوتے ہیں اور ہائی کورٹ کسی نہ کسی نکتے پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ مگر یہ اختلاف سپریم کورٹ سے نا وابستگی کی دلیل نہیں۔

موجودہ دور میں جہاں تک نماز، روزہ کا تعلق ہے۔ ہندوستان کی کثیر تعداد امام اعظم حضرت ابوحنیفہ کی تقلید کرتی ہے۔ مگر معاشرے میں حنفی حضرات امام شافعی کے فقہ کو قانوناً مان گئے ہیں۔ ہم جس امام کی تقلید کریں ہم صحیح راستہ پر ہیں اور آپس کی نوک جھونک ایک فضول سی چیز ہے۔

مسلمانوں میں بہت سے عقائد اس طرح مان گئے ہیں جو ایمانیات کا درجہ لے بیٹھے ہیں۔ مثلاً پل صراط کو مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت میں ہر ایک انسان کو ایک پل سے گزرنا پڑے گا جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز تر ہے۔ اس پل پر تھوڑی دور چلنے کے بعد دوزخ میں گر جائینگے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پل پر سے گزرنے کا مرحلہ کب پیش آئیگا۔ پل صراط ہو یا نہ ہو مگر حساب کتاب تو قرآن سے ثابت ہے۔ اگر ہوں

کہ حساب سے پہلے یہ مرحلہ پیش آئیگا تو حساب کتاب سرے سے ہی غائب ہو جاتا ہے۔اور اگر کہوں کہ حساب کتاب کے بعد فرمان الٰہی اس پُل سے گزرنے کے متعلق ہوگا۔تو نعوذ باللہ خدا کے انصاف پر حرف آتا ہے۔کیا خدا کو اپنے انصاف پر یقین نہیں کہ وہ Trail by Ordeal کڑی آزمائش سے گزرنے کے ذریعہ خود اپنے انصاف کی جانچ کرنا چاہتا ہے۔تعجب ہے مولانا سیّد سلیمان ندوی نے بھی سیرت النبیؐ کے پانچویں جلد میں اس پُل کو ایک حقیقی پُل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔حالانکہ پُل صراط کا لفظ بھی کہا ہے کہ یہ عربی نہیں ہے عجمی لفظ ہے۔درحقیقت اس پُل کا عقیدہ مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے عقیدوں سے پیچھے کے دروازہ سے داخل ہوا ہے۔ہندؤوں کے یہاں بھوَ ساگر (भव सागर) کا عقیدہ انکے شاستروں نے دے رکھا ہے۔جسے ہندو بیتر نی پار کہتے ہیں اور جسے یہ گائے کی دُم پکڑ کر پار اُتریں گے۔اسی سے ملتا جلتا عقیدہ زرتستیوں کے یہاں بھی ہے اور کسی حد تک عیسائیوں میں بھی ہے۔یہ اقوام جب اسلام کے آغوش میں آئے تو اپنے اپنے عقیدے بھی ساتھ لائے۔اس کو مسلمانوں نے اپنے الفاظ میں پیش کردیا اور پھر یہ عقیدہ اتنا جڑ پکڑ گیا کہ جاہل تو جاہل بڑے بڑے عالم بھی اس عقیدہ سے سر مُوتجاوز کرنا کفر سمجھنے لگے۔حالانکہ ہم نماز کی ہر رکعت میں خدا سے صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت مانگتے ہیں۔ظاہر کہ صراط کا تعلق اپنی موجودہ زندگی ہی سے ہے۔فرض کیجئے ایک لق ودق میدان میں آپ تنہا چل رہے ہوں اور آپ سے کچھ فاصلہ پر ایک ایک اور آدمی بھی جا رہا ہو،پھر آپ نے آگے چل کر ایک منی بیگ (Money Bag) راستہ میں پڑا دیکھا۔آپ اسے اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اس میں ہزاروں روپیئے پڑے ہیں۔اب آپ ضمیر اور نفس امارہ میں ایک کشمکش ہوتی ہے کہ اس منی بیگ کو ہم خود رکھ لیں یا آگے جانے والے کے حوالے کردیں۔اب ذرا سوچئے کہ یہ راہ کتنی باریک اور تیز (دھاردار) ہوگی۔اسی راہ کا نام خواہ پُل صراط کہوں یا صراطِ مستقیم۔غرض عقیدۃً یہ اس پُل کو تسلیم نہیں کرتے جسے عام طور سے مسلمان مان بیٹھے ہیں۔

اسی طرح منکر نکیر کا معاملہ بھی ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں نے قبر کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ قبر کی معنی اس گڑھے کو سمجھتے ہیں جہاں یہ اپنے مردے گاڑتے ہیں۔ اگر اس تنگ معنی میں قبر کو لیں تو وہ قوم منکر نکیر کے سوال و جواب سے صاف نجات پا لیتی ہے جو اپنے مردوں کو مٹی کے اندر دفن نہیں کرتی ہے۔ مثلاً آتش پرست اپنے مردوں کو ایک اونچے مخصوص مچان پر چھوڑ آتے ہیں، جنہیں گدھ اور چیل، کوے نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ ہندو، بدھسٹ، جینی اور سکھ اپنے مردوں کو جلا دیتے ہیں یا ندی میں بہا دیتے ہیں۔ بہتوں کو جنگلی درندے کھا جاتے ہیں اور کتنے آگ میں جل کر فنا ہو جاتے ہیں، کتنے ڈوب جاتے ہیں۔ اب اگر ہم منکر نکیر کے سوال کو صرف قبر تک محدود رکھیں تو بڑے خوش نصیب ہیں وہ جنہیں مٹی کے اندر دبایا نہیں گیا اور وہ صاف اس سوال و جواب سے بری ہو گئے۔ مگر مسلمان ہیں کہ اس عقیدہ سے انحراف کرنا، اسلام سے خارج ہو جانا ہی سمجھتے ہیں۔ سوال منکر نکیر کے صرف اس بات کا ہے کہ جو روح اس مادی دنیا سے پرواز کر کے آخرت کی طرف سدھار رہی ہے، وہ حقیقت میں کس گروہ سے آ رہی ہے اور وہ مسلم ہے یا غیر مسلم۔ یہ مرحلہ صرف روح کے ساتھ ہے۔ اسے مادی جسم سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک قیامت کا تعلق ہے۔ شمس صاحب عوامی عقیدہ سے کچھ الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ قیامت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قیامت صغریٰ اور دوسری قیامت کبریٰ۔ ہر انفرادی موت قیامت صغریٰ ہے۔ مگر ایک دن وہ آئے گا کہ زمین و آسمان سب چکنا چور ہو جائینگے۔ اور روئے زمین پر بسنے والے سارے انسان یک دم موت کے گھاٹ اتر جائینگے۔ وہ ہوگی قیامت کبریٰ۔ صغریٰ ہو یا قیامت کبریٰ۔ قیامت قیامت ہی ہے۔ قیامت کے معنی ہی ہیں کھڑے ہونے کے۔ اب مسلمان ہیں کہ انفرادی موت ہونے پر انکی روح یا وہ مخصوص آدمی عالم حشر کے میدان میں بغیر حساب و کتاب کے قیامت تک پڑا رہے گا اور قیامت کبریٰ کے بعد اپنے اپنے اعمال کے مطابق جسے جہاں جانا ہوگا چلے جائینگے۔ اس مسئلہ پر شمس صاحب کا عقیدہ یہ

ہے کہ ہم ایمان ہی موت کے بعد جی اٹھنے پر لائے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔اس آیت میں اگر غور سے دیکھا جائے، عالم برزخ والے عقیدے کو بیچ ہی سے غائب کردیا ہے اور حساب کتاب کا جو ہنگامہ مسلمانوں نے کھڑا کر رکھا ہے، وہ تو صرف چند ثانیوں کا مرحلہ ہے یعنی منکر نکیر کے سوال اور روح کے جواب ہی نے فوراً طے کردیا کہ یہ مشرک ہے یا مومن۔

شمس کے اس عقیدے کی تائید بخاری شریف کی ایک حدیث بھی کرتی ہے۔ایک صحابی حضورؐ سے بار بار پوچھتے تھے کہ قیامت کب آئی گی۔حضورؐ نے ایک بچے کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ جب یہ بچہ جوان ہوگا۔اس وقت تمہاری قیامت ہو جائیگی۔اس حدیث نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جوں ہی ایک شخص اس دنیا سے گزرتا ہے اسکی قیامت ہو جاتی ہے۔اب گزرنے والا انفرادی حیثیت سے جائے یا اجتماعی حیثیت سے غرض اس معاملہ میں بھی انکا عقیدہ عام مسلمانوں سے بالکل مختلف ہے۔

مسلمانوں کے اندر جو مذہبادفرقے ہیں اور جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔انہیں یہ پاگل ہی سمجھتے ہیں۔انکا خیال ہے کہ یہ اسلامی روح سے ناواقفیت کی دلیل ہے یا یہ علمائے کرام اپنے حلوے مانڈے کے انتظام میں اس قسم کے شوشے نکالتے ہیں اور مسلمانوں کو آپس میں بالاوجہ لڑاتے ہیں۔

مشکل تو یہ ہے کہ سالہا سال سے جو عقیدے مسلمانوں کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہیں انہیں چشم زدن میں دور کرنا بہت ہی مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔اگر ٹھنڈے دل سے تعصب و برطرف کرکے ان مسئلوں پر غور کیا جائے تو ہر مسلمان انکی رائے سے متفق ہو جائے گا۔

اس قبیل کے بہت سے چھوٹے موٹے اور بھی عقائد ہیں۔جن میں شمس صاحب اپنی الگ رائے رکھتے ہیں۔سب سے زیادہ افسوس انہیں اس وقت ہوتا ہے۔جب شیعہ اور سنی آپس میں ان باتوں پر الجھ جاتے ہیں۔جنکا تعلق چودہ سو سال پہلے

مذہب سے نہیں سیاست سے تھا۔ اگر ہمارے بزرگوں سے نعوذ باللہ کچھ غلطی ہو بھی گئی تو پھر ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر جنکا تعلق ایمانیت سے نہیں آپس میں لڑنے سے کیا فائدہ" خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست" لڑائی جھگڑے یا بحث ومباحثے سے شیعہ نہ سنی کو قائل کرسکتا ہے نہ سنی شیعہ کو۔ ہر انسان کو اختیار ہے کہ وہ جس عقیدہ کو چاہے اپنے سینے سے لگا رکھے۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں کہ اپنے عقیدہ کو دوسرے پر تھوپنے کیلئے جنگ وجدل بھی کرے۔ سنی حضرات حضرت ابوبکرؓ کو افضل البشر بعد از انبیاء مانتے ہیں اور شیعہ حضرت علیؑ کو۔ اس بات پر آپس میں جوتے پیزار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس عقیدہ کا جہاں تک تعلق ہے شمس صاحب بھی عام سنیوں جیسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہاں یہ حضرت معاویہ اور یزید کو بھی برا بھلا کہنا روا نہیں سمجھتے۔

سرورکائناتؐ کے معراج کے متعلق بھی انکا عقیدہ عام مسلمانوں سے ہٹ کر ہے۔ ایک زمانہ سے مسلمان اس نکتہ پر الجھ رہے ہیں کہ حضور کی معراج جسمانی تھی یا روحانی۔ مسلمانوں کی اکثریت حضور کی معراج کو جسمانی سمجھتی ہے۔ مگر جو انکی معراج کو روحانی کہتے ہیں انکی دلیل بھی کچھ ایسی کمزور نہیں کہ آسانی سے رد کردی جائے۔ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی اور انکے پیروؤں نے اس معراج پر ایک الگ ہی باب قائم کیا ہے اور اپنے قلم کا سارا زور حضور کی معراج کو روحانی ثابت کرنے پر صرف کردیا ہے۔ بہر حال مسلمانوں کا ہر فرقہ حضور کی معراج کو تسلیم کرتا ہے۔ مگر لے دے کر سب یہی کہتے ہیں کہ اس معراج کی غرض وغایت صرف آسمان کی سیر اور جنت ودوزخ کا معائنہ تھا۔

شمس صاحب کا کہنا ہے کہ اگر صرف اتنی سی بات کیلئے معراج جیسا عظیم الشان واقعہ ظہور پزیر ہوا تو یہ حضور کی شان میں کسی حد تک گستاخی ہوجاتی ہے۔ کیا حضور کے ذہن میں کبھی یہ خیال آیا ہوگا کہ جنت ودوزخ کا وجود مشتبہ ہے۔ جیسے خدا نے انہیں دکھلا کر یقین دلایا۔ جبکہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کسی پیغمبر کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہیں آیا اور سب کے سب جنت ودوزخ کے وجود پر یقین کامل رکھتے تھے۔ آج بھی ہم میں بہتوں نے

لندن اور پیرس کو نہیں دیکھا ہے مگر سب کے سب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دونوں شہر اس کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جب تک ہم ان شہروں کو نہ دیکھیں ہم انکے وجود سے انکار کردیں۔ یہ معراج، معراج نہ ہوئی بلکہ ایک تفریحی سیر ہوگئی۔

اس قسم کا معائنہ صرف حضورؐ ہی کے ساتھ محض نہیں بلکہ ایک دفعہ شری کرشن جی نے عین میدان جنگ میں گیتا کا اپدیش دیتے ہوئے ارجن جی کو اپنے سینے کی طرف دیکھنے کو کہا۔ اور جب ارجن نے انکے سینے پر نگاہ ڈالی تو انہیں ساری کائنات اس میں نظر آنے لگی۔ حتیٰ کہ چلنا پھرنا، مرنا جینا سب اس میں نظر آرہے تھے۔ اسی چیز کو حضورؐ نے بھی زیادہ سے زیادہ دیکھا ہوگا۔ اگر ہم مسلمانوں کے عام عقیدے کو تسلیم کرلیں۔

دوسرا واقعہ حضرت مسیحؑ کے ساتھ پیش آیا۔ شیطان حضرت مسیحؑ کو پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور وہیں سے اس نے آپکو پوری کائنات کی زیارت کرادی عرش و کرسی، جنت و دوزخ، سب کا معائنہ حضرت مسیحؑ نے شیطان کے ایک ادنیٰ سے کرشمہ پر اکتفا کرلیا۔ یہ دونوں واقعے آپ کو گیتا اور انجیل میں مل جائنگے۔ لیکن معراج کی خصوصیت ان دونوں واقعے سے مختلف ہے۔

شمس صاحب نے اپنے ایک طویل مضمون میں جسے عظیم آباد ایکسپریس، پٹنہ نے قسطوار ۲۵ رمئی ۱۹۷۵ء سے ۱۲ رجون ۱۹۷۵ء تک شائع کیا ہے۔ انکے عقیدہ کے مطابق جسے یہ قرآن شریف کی آیتوں سے ثابت کرتے ہیں، اس دنیا کے علاوہ اور بھی بہت ساری دنیائیں ہیں، جہاں ہم انسانوں جیسی مخلوق بستی ہے اور جن میں دنیاوی نبیوں کی طرح وہاں بھی نبی اور رسول آتے رہے اور وہاں والوں کی ہدایت فرماتے رہے۔ مگر خاتمیت کا اعزاز صرف حضورؐ ہی کو بخشا گیا۔ غالبؔ کہتا ہے ؎

منشاء ایجاد ہر عالم یکے ست

گردو صد عالم بعد خاتم یکے ست

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمت العالمینے ہم بود

اب یہ نہایت ضروری تھا کہ ان عالموں میں بھی حضورؐ کو پیش کیا جائے تا کہ وہاں کے لوگ اپنے رحمت العالمین کی زیارت کرلیں اور انہیں یقین ہو جائے کہ جس خاتم النبیین کا تذکرہ انکے پیغمبروں نے ان سے کیا ہوگا وہ دنیا میں تشریف لا چکے اور وہ بزرگ ہستی یہی ہیں۔

شمس صاحب حضورؐ کی معراج جسمانی اور عین بیداری پرعقیدہ رکھتے ہیں۔مگر اغراض اور واقعات کا انکار کرتے ہیں جو عام طور سے مسلمانوں میں مشہور اور حدیثوں میں مرقوم ہیں۔ہمیں حیرت ہوئی ہے کہ بہار کے اس پورنیہ جیسے بنجر علاقہ میں ایک شخص ایسی بات سوچ سکتا ہے اور پھر اپنے عقیدے کو قرآن سے ثابت کرسکتا ہے۔

جہاں تک قوم اجنہ کا تعلق ہے شمس صاحب کا عقیدہ ہے کہ ایسی کوئی قوم اس کرۂ ارض پر نہیں بستی۔ بلکہ جن دوسری دنیا کی مخلوق ہے۔خدا نے انہیں بھی اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے اور قرآن کی بہت سی آیتیں اس پر صاد ہیں کہ انہیں بھی انسانوں کی طرح دوزخ یا جنت میں جانا پڑیگا۔انکے اعمال کا بھی قیامت کے روز حساب کتاب ہوگا۔غرض انسان اور اس قوم میں ساری باتیں مشترک ہیں۔بجز تخلیق کے کہ انسان کی تخلیق خاک سے ہوئی اور جنوں کی آگ سے۔مگر خاک اور آگ مادی چیز یں نہیں بلکہ ایک کیفیت کی علامت ہے۔یعنی دونوں کے مزاج میں وہی فرق ہے جو خاک اور آگ میں ہے۔مگر تخلیق کے بعد دونوں زندگی کے ایک ہی قسم کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔رسول اور نبی دونوں قوم میں انکی ہدایت کیلئے آئے۔البتہ حضورؐ کو جنوں کی دنیاؤں میں پہنچایا۔ کیونکہ یہ خاتم النبیین تھے۔

جس طرح ہم ہندوستانی باہر سے آنے والوں کو ولایتی کہتے ہیں۔لفظ ولایتی میں ہرقوم وملک کے لوگ شامل ہیں جو ہندوستانی نہیں۔آریوں نے دوسرے ملک کے

رہنے والوں کو ملیکش کہا، عربوں نے غیر عربوں کو عجمی کہا۔ اسی طرح خدا نے جب انسان کے ساتھ جب دوسری دنیاؤں کی ان مخلوقات کو جو انسان سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ایک لفظ میں ''جن'' کہہ دیا۔ یعنی اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیاؤں کی مخلوق کے الگ الگ نام نہ بتلا کر صرف ایک لفظ جن سے کام نکال لیا گیا اور پھر قرآن میں اعلان کیا کہ ہم نے انسان اور جن کو صرف اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔

عام طور سے مسلمانوں کا عقیدہ جن کے متعلق یہ ہے کہ ایسی ہستی جسے ہماری نظر تو نہیں دیکھ سکتی مگر وہ ہمیں دیکھتی ہے۔ اور اس ہستی کو خدا نے ایسی طاقت دے رکھی ہے کہ وہ جب چاہے مادی شکل وصورت اختیار کر لے۔ خواہ یہ شکل انسان کی ہو یا جانور کی۔ ان جنوں کو یہ بھی طاقت ہے کہ غیر مرئی طور پر کسی انسان کے سر پر سوار ہو جائیں اور اس انسان کی زبان سے اپنے الفاظ بولنا شروع کردیں اور اگر ناراض ہوں تو اسکا ستیاناس کردیں۔ مگر قرآن پاک میں ایسی کسی مخلوق کا تذکرہ نہیں ہے اور ہم مسلمانوں کا ایمان قرآن کے ایک ایک لفظ پر ہونا چاہئے۔ ہم کیسے مسلمان ہیں کہ قرآن پاک میں جسکا اشارہ نہ ہو ہم نے اپنی طرف سے ایسی ایسی مضحکہ خیز باتیں گھڑ کر اپنے عقیدے میں شامل کر رکھا ہے۔ مگر چونکہ یہ عقیدہ مسلمانوں کے اندر زمانہ دراز سے گھس گیا ہے اور اس لفظ جن نے انہیں اتنا خوفزدہ کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی۔

ہندؤں اور عیسائیوں میں بھوت پریت اور چڑیل خبیث روح کا وجود عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر عیسائیوں نے Ghost and devil spirit کے وجود کا انکار کر دیا تو موجودہ انجیل آدھے سے زیادہ برباد ہو جائیگی۔ اسلئے کہ حضرت مسیح زندگی بھر اسرائیلیوں کے بدن سے بھوت پریت ہی نکالتے رہے اور ہندوؤں کو بھی بھوت پریت پر یقین رکھنا انکے شاستروں سے ثابت ہے۔ جب ایک آدمی مر جاتا ہے تو اسکی روح اس وقت تک پریت ہی رہتی ہے۔ جب تک اسے دوسری ''یونی'' نہ ملے۔ اس طرح بھوتوں اور پریتوں کی ایک فوج دنیا میں گھوم رہی ہے۔ گرچہ ہمیں نظر نہیں آتی۔ ہر

مذہب والے نے یہ چاہا کے اسکے عقیدے کو بھی دوسرے مذہب والے تسلیم کرلیں اور ان دونوں قوموں نے مسلمانوں کے اندر اس عقیدے کو بھی داخل کردیا۔ مسلمانوں کے یہاں لفظ جن پہلے ہی سے موجود تھا۔ ان لوگوں نے بھی جنوں کو وہی خصوصیتیں دے ڈالیں۔ جنہیں ہندؤوں اور عیسائیوں نے بھوت اور پریت سے متعلق کررکھا ہے اور اب اس مخلوق کا نام ہندؤوں کے یہاں پریت، عیسائیوں کے یہاں Ghost اور مسلمانوں کے یہاں جن ہوگیا۔

شمس صاحب نے اس مخلوق کا مطلق انکار کیا۔ مگر لوگ ہیں کہ آئے دن عجیب عجیب کہانیاں جنکا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں گڑھتے رہتے ہیں اور خواہ مخواہ جن جیسی بہترین مخلوق کو بھوت اور پریت سے تعبیر کرتے ہیں۔

شمس صاحب انسان کو فرشتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی تائید میں قرآن پاک کے اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں کہ انسان ایک ایسی مقدس اور اشرف ہستی ہے جسکے سامنے فرشتوں نے سر جھکایا۔ اب لازم ہے کہ انسان کا سر دنیا کی مخلوق کے سامنے نہ جھکے بلکہ اسکا سر جھکے تو صرف اپنے خالق کے سامنے اور شاید اسی لئے خدا نے کہا کہ وہ مشرکین کو نہ بخشے گا۔ جو خود مسجود ملائک ہو، یہ کتنا اندھیر ہے کہ وہ اپنے کمتر اور ذلیل ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

شمس صاحب وہابی تھے مگر میلاد کی مجلسوں میں قیام کو بے حد ضروری سمجھتے تھے اور جو قیام نہیں کرتا اُسے یہ بُرا بھلا بھی نہیں کہتے۔ شمس کی زندگی علامہ اقبالؔ کے اس شعر سے مشابہ نظر آتی ہے۔

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

(اقبالؔ)

شمس صاحب اقبال کے اس شعر کی چلتی پھرتی شرح تھے۔دنیا کے ہر مذہب کے رہنماؤں کی قدرومنزلت بہ دل وجان سے کرتے تھے اور بڑی عزت وبھگتی سے انکے نام لیتے تھے اور اپنی تقاریر میں ان مذہبی رہنماؤں کے حالات پر بھی روشنی ڈالتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ اسلام سارے مذاہب کی خوبیوں اور اچھائیوں کا مجموعہ ہے۔جس طرح شہد کی مکھی بہت سارے پھولوں سے شہد لالاکر اپنے چھتے میں جمع کرتی ہے۔اسی طرح تمام مذاہب کے چمنستان کے خوشبودار پھولوں سے لالاکر ایک کوزہ میں شہد جمع کیا گیا ہے۔اسی شہد کا نام اسلام ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایک سورۃ کا نام ہی شہد ہے یعنی (شہد کی مکھی)۔

شمس صاحب کے عقائد اور Believes کی جھلکیاں انکے قطعات میں بھی جابجا ملتی ہیں۔مثلاً ذیل کا قطعہ جہاں انکے مسلمان ہونے کی غمازی کرتا ہے۔وہیں آداب زندگی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

موسیٰ شرر برق بہ سفاک وغوی ہیں
عیسیٰ خبر صلح بہ کمزوروقوی ہیں
جینے کیلئے مصحف وشمشیر ہیں لازم
ہم معتقد معجزۂ مصطفوی ہیں

★★★

شمس بمن گرامی بہ حیثیت شاعر

شمس بمن گرامی کی زندگی کے حالات اور انکی نشو ونما کی تفصیلات سے ظاہر ہے کہ انہوں نے ہنگامہ خیز ماحول میں پرورش پائی تھی۔اصلاحی تحریکات نے ہندوستانی شعورِ حیات میں ایک نئی انگڑائی پیدا کی تھی۔سیاسی،قومی اور ادبی سطح پر ایک نئے عوامی ماحول کی تشکیل کیلئے خیالات اور اقدامات دونوں ہی کی گرم بازاری تھی۔بین الاقوامی سطح پر جو تغیرات رونما ہو رہے تھے،ہندوستان کے حالات بھی ان سے اثر انداز ہو رہے تھے۔پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔اسی دوران بہت سے ملکوں کو تباہی و بربادی کے انتہائی خوفناک مرحلوں سے گذرنا پڑا۔دنیا کا شاید ہی کوئی قابل ذکر ملک ایسا ہو جسے اس عالمگیر غارتگری نے اثر انداز نہ کیا ہو۔ ۱۹۱۷ء ہی میں کانگریس نے اپنے ایک سالانہ اجلاس میں تجویز منظور کر کے برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو نوآبادیات کے نمونے پر آزادی دے دی جائے۔چنانچہ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ نے نظام سلطنت میں ہندوستانیوں کے مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے کئی اہم حقوق دینے کا اعلان بھی کر دیا۔مگر ہندوستانیوں کے اضطراب میں کمی نہ آئی۔ ۱۹۱۹ء میں ملک گیر پیمانے پر ایک زبردست ہڑتال ہوئی۔جس نے برطانوی اقتدار کو متزلزل کر دیا۔ ۱۹۲۰ء ٹریڈ یونین کانگریس قائم ہوئی اور اسی سال گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک شروع کی۔اسی دوران خلافت تحریک نے عوامی حلقے میں پنپنے والی سرگرمیوں کو اور زیادہ تقویت پہنچائی۔آئندہ بیس برسوں میں یعنی ۱۹۴۰ء تک ان سیاسی اور قومی تحریکوں کا زور بتدریج بڑھتا ہی گیا۔اسی وقفے میں ہٹلر کا طوفان برپا ہوا۔جس نے تمام اہم اقوام عالم کو زد میں لے لیا۔یورپ اور ایشیاء کے کئی ملکوں میں حالات سنگین ہو گئے۔بقول ڈاکٹر اعجاز حسن،

''جرمن قوم کے زبردست رہنما ہٹلر نے پولینڈ کے خلاف لڑائی شروع کر

دی۔دودن کے بعد اس حادثہ سے متاثر ہوکر برطانیہ اور فرانس نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔رفتہ رفتہ لڑائی قیامت خیز ہوگئی۔تمام اقوام عالم اسکی لپیٹ میں آگئیں۔جرمنی کے خاص حلیف اٹلی اور جاپان تھے۔مخالف میں فرانس برطانیہ،امریکہ وغیرہ تھے۔خلاف امید یہ لڑائی اتنے بڑے پیانے پر چھڑ گئی کہ شاید اس سے پہلے تاریخ کی دنیا میں اسکی نظیر نہ ملے۔۔۔۔۔ہندوستان اسکے آتشیں حملوں کی زد میں آ گیا''۔

(اردو ادب آزادی کے بعد از ڈاکٹر اعجاز حسن)

ایک طرف یہ بین الاقوامی صورتحال تھی،دوسری طرف ملکی اور مقامی حالات کی تیز رفتار سرگرمیاں تھیں۔کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست نے تصادم وتعارض کی ایسی فضا پیدا کرر کھی تھی کہ ہندوستان کا ہر طبقہ اور حلقہ متاثر ہور ہا تھا۔

انہیں سیاسی تصادمات کے دوران ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔اس تحریک کے زیر اثر ایک ایسا انداز نمایاں ہوا کہ جولوگ اس سے وابستہ نہ تھے انہوں نے بھی ترقی پسندانہ شعار کو اختیار کرنے سے گریز نہیں کیا۔بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

''۱۹۱۸ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ہندوستان میں بھی پڑی۔اسمیں حصہ لینے والوں کا زیادہ رجحان اشتراکیت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا تھا۔۔۔۔طرز بیان میں گرمی اور انداز فکر میں تازگی ایسی تھی کہ جولوگ اس اسکول سے صحیح طور پر وابستہ نہ تھے۔وہ بھی اسی ڈھنگ سے سوچنے اور شعر کہنے میں بھی فخر محسوس کرنے لگے۔'' (اردو شاعری کا سماجی پس منظر)

ہندوستان کی یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس نے خاص وعام وا پنی طرف متوجہ کیا تھا اور جسکے سامنے قومی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں واضح مقصد موجود تھا۔ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے اسی تحریک کی تاریخ اور اسکے فروغ کے اسباب ونتائج پر روشنی ڈالنے کے دوران نشاندہی کی ہے:۔

''یہ ہندوستان کی پہلی ادبی تحریک تھی جسمیں نہ صرف اردو کے ادیب شامل تھے

بلکہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی نظریاتی اتحاد کی بنیاد پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے۔ ملک کے بزرگ اور کم ادیب نوجوانوں کی کوشش کو سراہ رہے تھے کہ انکی بدولت ہمارا ادب قوم و معاشرے کے مطالبات سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے اور ادب کے انسانیت جمہوریت اور اخوت مساوات کے صحتمند خیالات کی ترویج ہو رہی ہے، جو اسکا حقیقی منصب ہے۔" (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ۴۲)

ترقی پسند تحریک کے یہ اثرات ہمہ گیر نوعیت کے حامل تھے۔ ظاہر ہے کہ سرزمین بہار کا ان اثرات سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہ تھا۔

احمد حسین شمس بمن گرامی کی ذہنی نشو ونما اسی صورتحال میں ہوئی۔ انہوں نے آزادی کے آس پاس کے معاملات و مسائل کو قریب و غور سے دیکھا اور آزادی کے بعد کے حالات کا مشاہدہ اور تجربہ بھی انہوں نے خلوص وانہماک کے ساتھ کیا۔ اگرچہ وہ ترقی پسند تحریک میں باضابطہ شامل نہ ہوئے۔ لیکن اس تحریک نے جن اثرات کو فروغ دیا تھا اور ادبی اسالیب و موضوعات کے برتاؤ میں نئی جہتوں کے دریافت کی جو کاوشیں کی تھیں شمس کی شاعری انکی بخوبی وضاحت کرتی ہے۔ انکے شاعرانہ مزاج واسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی کورانہ تقلید سے انحراف کیا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے زمانے ۱۹۳۶ء میں انکی عمر ۱۵ سال (سال ولادت ۱۹۲۱ء تھی)۔ گویا عنفوان شباب کے مرحلوں سے گزر کر وہ شعوری ارتقاء کی منزلوں میں داخل تھے ۱۹۴۳ء میں شمس نے تعلیم کو مکمل کرکے باضابطہ پیشہ وکالت اختیار کر لیا تھا۔ یہی زمانہ شعری اسالیب و موضوعات میں تیز رفتار تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ ان تبدیلیوں سے ایک باشعور کا دامن کش رہنا بھی ممکن نہیں ہے۔ سرزمین بہار کے شاعروں میں احمد حسین شمس کی شخصیت اس اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے کہ وہ کسی سیاسی یا نیم سیاسی ادبی تحریک سے براہ راست وابستہ نہ ہوئے۔ اسکے باوجود انکے شاعرانہ اسلوب و مزاج

پرعصری تحریکات وتغیرات اثر انداز ہوتے رہے۔آزادی اور تقسیم کے ردِ عمل میں نمایاں ہونے والے حالات کا مشاہدہ بھی انہوں نے قریب وغور سے کیا اور انہیں سے متعلق معاملات و مسائل سے اپنی شاعری کے موضوعات بھی اخذ کئے۔نظام حیات کی اذیت آمیزفرسودگی کومحسوس کرتے ہوئے انہوں نے یہ تاثر پیش کیا ہے ۔

فرسودہ نظام چمن دہر بدل دو
جس گُل میں تمنائے تشدّد ہو مسل دو

اک جان کا ہوتا ہے زیاں ہم نے یہ مانا
قبل اسکے کہ ڈس لے، سرافعی کا کچل دو

اتنی زہر آلودہ فضا ہے سڑکوں کا بھی دم گھٹتا ہے
لوگ کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں اور ہمارا گھر جلتا ہے

دیکھنا یہ رات کالی صبح تک ہر ستارے کا لہو پی جائے گی

خون میں بس کر ہوائیں شہر کی
اب مری دہلیز تک بھی آ گئیں

ہر ذرہ اپنی ذات سے ٹوٹا ہے اس طرح
ہر سمت آج پھیل گئی ہے انار کی

اس نوعیت کے بہت سارے اشعار کلام شمس میں موجود ہیں۔جنکے مطالعے سے نشاندہی ہوتی ہے کہ شاعر نے اپنے زندگی کی تجرباتی صداقتوں اور ان سے وابستہ محرومیوں اور مسرتوں کو انسانی ہمدردی اور دردمندی کے ساتھ اپنی شعری کاوشوں کے وسیلے سے پیش کیا ہے۔اس ضمن میں ان کی ایک طویل نظم ''جلتے خیموں کی چیخ'' بہ طور خاص قابل توجہ ہے۔یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے کا ضمنی عنوان ''دہشت'' اور دوسرے کا ''خلفشار'' ہے۔شاعر نے اس نظم میں عصری زندگی کو موضوع بنایا ہے۔اسلامی

روایات اور یونانی اور ہندوستانی ضمنیات سے استفادہ کرتے ہوئے شاعر نے انسانی حقوق کی پامالی اور انسانیت سوزی کے میلان پر شکوے کا پر خلوص لب ولہجہ اختیار کرتے ہوئے اخیر میں فکر واحساس کے جس اندیشے کو پیش کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں ۔

بغیر اذن پتی بھی ہلتی نہیں ہے
دکانوں میں کیا چیز ملتی نہیں ہے
وہ کون آستیں ہے کہ سلتی نہیں ہے
کلی کون سی ہے جو کھلتی نہیں ہے

ذرا چوک بازار جا کر تو دیکھو
جو مانگو ملے گا جو چاہو خریدو

زمینوں، سفینوں، مکانوں کی لعنت
تواریخ کی داستانوں کی لعنت
علاقوں کی لعنت زبانوں کی لعنت
مسلط ہے سب پرنشانوں کی لعنت

یہ لعنت قیامت اُٹھا کر رہے گی
جہان سکوں کو مٹا کر رہے گی

اس شاعرانہ تاثر کا سبب یہ ہے کہ شمس نے محنت کش طبقہ کی عسرت مندانہ زندگی کی تکلیفوں کو بھی محسوس کیا ہے اور عام انسانوں کی محرومیوں کا احساس بھی ان کو ہے۔ شہرو دیہات کے ماحول میں المنا کیوں کا راج اور اہل زر آج بھی غریبوں کے مفادات کے استحصال میں مصروف ہیں۔ اسی نظم کے یہ دو بند ملاحظہ فرمائیں ۔

یہ دہقان مضراب کی چوٹ کھا کر
بج اٹھتے ہیں بربط صفت جھنجھنا کر

مظالم سے عفریت سے تنگ آ کر
سوئے شہر چل پڑتے ہیں مُنہ اُٹھا کر
مگر پاؤں میں گڑ گئے چند کانٹے
یہاں بھی لگے ان کے گالوں پہ چانٹے
دھواں کا رخانہ اگلتا رہے گا
مگر خون مزدور جلتا رہے گا
جو بھٹی میں لوہا پگھلتا رہے گا
تو لوہے سے ہتھیار ڈھلتا رہے گا
ادھر اہل کی گر دنیں کاٹتے ہیں
ادھر اہل زر انگلیاں چاٹتے ہیں

یعنی یہ کہ آزادی کے بعد بھی عام انسانوں کی زندگی اذیتوں اور مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے سے قاصر رہی۔اسلحہ کی دوڑ نے عوامی ماحول کی سختیوں میں روز بروز اضافہ ہی کیا اور انسانی معاشرے کو ہر لمحہ تندوتیز تلخیوں کا سامنا رہا۔ شمس بمن گرامی نے عصری زندگی کی ان کرب آمیز صداقتوں کے سلسلے میں اپنے ردِعمل کو نہایت خوش اسلوبی سے قلمبند کیا ہے۔ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انہوں نے کسی خاص نکتۂ نظر کی تبلیغ وترویج نہیں کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ کوئی سیاسی نکتۂ نظر ان پر حاوی نہیں ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کلام شمس میں سیاسی خیالات اور سیاسی تصورات کی گونج نہیں سنائی دیتی۔اشترا کی نظریات کا غلبہ نہیں ہے۔انسانی معاشرے کے تجرباتی دکھ سکھ کا جائزہ سیاسی عینک کے سہارے انہوں نے پیش نہیں کیا ہے۔اسی لئے کوئی نظریاتی جوش یا ذہنی تحفظ کلام شمس میں نہیں ملتا۔انکے شاعرانہ لب ولہجہ میں جو سنجیدگی اور متانت موجود ہے،اسکا سبب یہی ہے۔ادیب وشاعر کیلئے اپنی آنکھوں کو کھولے رکھنا تو ضروری

ہے، اپنی تخلیقی بصیرت کو تجربہ و مشاہدہ کی فضاؤں میں آزادانہ پرواز کے مواقع فراہم کرنا تو ضروری ہے، کسی خاص سیاسی نقطۂ نظر سے منسلک ہو جانا اور اسکے تقاضوں کی تبلیغ و ترویج کرتے رہنا ہرگز درست نہیں ہے اُسکی وجہ سے تخلیقی تجربوں کی فنی حرمت نشانہ بن جاتی ہے اور شاعرانہ محاسن پس پشت چلے جاتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری کا ایک بڑا حصہ، اسی لئے گھن گرج اور جوش اور جذبے کا شکار ہو کر رہ گیا روایات کے انقطاع کے میلان نے شعر و شاعری کی مستحسن قدروں کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ فیضؔ کی شاعری، ترقی پسند شاعروں میں امتیازی اہمیت محض اسلئے رکھتی ہے کہ عام ترقی پسندوں کی طرح انہوں نے مستحسن شعری روایات سے اپنی تخلیقی بصیرت کو منقطع نہیں ہونے دیا ہے۔

★★★

شمسؔ کی شاعری کی قسمیں

اردو کی شعری صنفوں میں غزل کے شعار کو ایک قبولیت عام حاصل رہی ہے۔ اگر یہ صنف سخن ایجاز و اختصار کے سلسلہ میں اہمیت کی حامل رہی ہے اور کم سے کم لفظوں میں شاعروں نے اپنی تخلیقی بصیرت کے مظاہرے کر کے غزل کے شعروں کے مفاہیم و مطالب کو تہہ دار وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیق حسین:۔

''غزل کی جامعیت اور ہمہ گیری مسلم ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہر دلعزیز ہے۔ باوجود آسان ہونے کہ مشکل ہے۔ باوجود مختصر ہونے کہ ہر شئے کو سمیٹے ہے۔ جذبات نگاری، فطرت نگاری، صداقت پسندی، مصوری، فلسفہ، اشاریت، اخلاقیات کے خشک مسائل، سب کچھ اس میں ہیں۔''

غزل کی اسی خصوصیت نے اسکی صنفی توانائی و کشش کو ہر دور میں برقرار رکھا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے پہلے ریلے میں تو غزل کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی اور اسے بورژوائی تمدن کی علامت ٹھہرا کر اس سے انحراف کی کاوش بھی کی گئی، لیکن پھر

ترقی پسند شعراء بھی غزل کی زلف کے اسیر ہو گئے اور وہ بھی غزل گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ترقی پسند تحریک کے زمانہ فروغ ہی میں کلم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دے دیا۔مگر یہ ناقدانہ انکشاف بھی غزل گوئی کے میلان کو نقصان نہ پہنچا سکا اور اس کی محبوبیت برقرار رہی ۔دورنو کے تمام دوسرے شاعروں کی طرح شمس بمن گرامی نے بھی غزلیں کہی ہیں ۔انکی غزلوں میں تو ارضی زندگی کے مختلف النوع تجربوں کی کیفیت آئینہ سامان ہوئی ہیں ،شاعری کی دوسری صنفوں کے تخلیقی برتاؤ سے بھی انہوں نے گریز نہیں کیا۔ پابند اور آزاد نظمیں بھی انہوں نے کہی ہیں اور قطعات اور کنڈلیاں بھی شاعری کی ان تمام صنفوں کو شمس نے انسانی معاشرے کی تجرباتی صداقتوں کا مزاج داں بنائے رکھا ہے۔شخصی اور اجتماعی زندگی میں جو معاملات و مسائل پیش رہے ہیں ،ان سے پنپنے والی کیفیتوں کی ترجمانی انہوں نے خوش اسلوبی سے کی ہے۔انکے مشاہدات کی باریکی ،تجرباتی نیرنگی ،فکر واحساس کی تہہ داری اور پرخلوص تجرباتی ردعمل کی تفصیلات نے انکے شعری لب ولہجہ کو بے ساختہ بنا دیا۔تصنیفات سے بالعموم انہوں نے گریز کیا ہے۔مضامین وموضوعات کی جہت سے بھی اور لفظ واسلوب کے اعتبار سے بھی۔اپنے شاعرانہ تاثرات اور خیالات واحساسات کی پیشکش کے دوران شمس بمن گرامی نے واقعیت شعاری اور صداقت پسندی کے شعار ہی کو اہمیت دی ہے۔اسی خصوصیت نے انکے شعری لب ولہجہ میں ایک خاص تاثیر وتوانائی کو نمایاں کر دیا ہے۔ ہندی شاعری کے مزاج کو اردو شاعری میں برتنے کی وجہ سے ،انکے شاعرانہ اسلوب کی لطافت وحلاوت میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔شعری ہئیت اور اسلوب کے اس تنوع نے احمد حسین شمس کی شاعری میں زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔اس سے انکے شعری مزاج کی تنوع پسندی پر بہ خوبی روشنی پڑتی ہے۔

★★★

غزلیات

شعری اصناف میں غزل اپنے لب ولہجہ کی رمزی خصوصیت کی وجہ سے امتیازی قدر و قیمت کی حامل رہی ہے۔ داخلیت پسندی اسی صنف کے مزاج کا بنیادی پہلو ہے۔ خارجی ماحول کے واقعات وحالات کی آئینہ سامانی بھی اشعار غزل میں ہوتی ہے، مگر یہ آئینہ سامانی بھی داخلی کوائف کے پس منظر میں ہوتی ہے۔ غزل نگار، خارجی معاملات سے پہنچنے والے تاثرات کو اپنے تخلیقی شعور کا حصہ بنا کر غزل کے شعروں میں منتقل کرتا ہے۔ اسکی وجہ سے اشعار غزل میں سوز وگداز کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے اور یہی عنصر غزل کے شعروں میں جذبہ واحساس کی فضا کو قائم رکھتا ہے۔ ولّی سے لے کر غالبؔ تک کے تقریبا ڈیڑھ سو سال کے وقفے میں غزل نے اپنی صنفی تکمیل کے کئی اہم مراحل طئے کئے۔ غالبؔ کے فوراً بعد ہی آزادؔ و حالؔی نے ''انجمن پنجاب'' کے تحت موضوعی شاعری کے مزاج کو فروغ دینے کے دوران غزل کو نشانہ تنقید بنایا۔ حقیقتاً یہ حضرات، عظمت اللہ خان اور کلیم الدین احمد کی طرح غزل کے مخالف نہ تھے، بلکہ اسلوب غزل میں جو فرسودہ تقلیدی روش پیدا ہوگئی تھی، انہوں نے اسکی مخالفت کی تھی۔ آل احمد سرور نے اس پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''کہا جاتا ہے کہ آزاد و حالی نے سب سے پہلے غزل کے خلاف بغاوت کی۔ مگر دراصل آزاد اور حالی غزل سے باغی نہ تھے۔ اس غزل کے خلاف تھے، جو رسمی، محدود اور مصنوعی ہوگئی تھی۔ رسمی اس معنی میں کہ استادی شاگردی کی روایت، صنعتی معیار سے آگے بڑھ کر شاعر کی رائے کو بھی مقید کرتی تھی۔ محدود اس معنی میں کہ معاملہ، روزمرہ، صنائع وبدائع، تصوف اور فلسفہ کی آمیزش وغیرہ وغیرہ غزل کیلئے لازمی چیزیں بن گئی تھیں اور مصنوعی اس حیثیت سے کہ ناسخ اور انکے دہلوی مقلد شاہ نصیر نے غزل کو بھی دماغی ورزش یا کمال فن کا ذریعہ سمجھا یا تھا''

ان جہتوں سے آزاد وحالی نے غزل کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا، بالخصوص ''مقدمہ شعر وشاعری''میں حالی نے اصلاح غزل کے جو مشورے دئے، انکی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی، متاخرین کے دور میں مذکورہ نقائص موجود اور نمایاں تھے۔آزاد وحالی کے بعد جیسے جیسے ادبیات مغرب سے واقفیت وقربت بڑھتی گئی، موضوعی شاعری کی وسعتوں کو اہمیت دی جانے لگا۔غزل کے متعلق ان تمام تنقیدوں اور اعتراضوں کا فائدہ یہ ہوا کہ غزل کے صنفی معیار کو معتبر بنانے کے سلسلہ میں تخلیقی کاوشیں کی جانے لگیں۔

شمس بمن گرامی نے غزل کے صنفی مزاج کوملحوظ نظر رکھا ہے۔انکی غزلوں کے مطالعہ سے اسکی وضاحت ہوتی ہے کہ انہوں نے رسمیت، محدودیت اور تصنع سے اپنے دامن تغزل کو بچائے رکھنے کی کاوش کی ہے۔غزل کے قدیم لفظ واسلوب میں بھی انہوں نے نئے معنوی امکانات کی جستجو کی ہے۔حیات انسانی کی بے بضاعتی، دنیا کی بے ثباتی، بوقلموں کیفیات عشق، ارضی صداقتوں سے متعلق عصری محرومیوں اور انسانی تعلقات کی الجھنوں اور بے اعتباریوں کو شمس نے اپنی غزلوں میں جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے، اسکی وضاحت کیلئے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کچھ تو کہئے کہ فرد جرم ہے کیا   مر کے بھی قید زندگی نہ گئی

کہاں پناہ ملے گی ہماری سوچوں کو   جب انحراف کے سب گھر اجڑ گئے بھائی

کرچیاں لگیں چبھنے پاؤں میں نگاہوں کے   چور کردئے شیشے گھر کے دیوتاؤں نے

اب خود کو چھپاؤں تو کہاں جاکے چھپاؤں   آندھی درودیوار کے باہر تو نہیں ہے

ابھی تو چند قدم ہی چلے تھے ہم گھر سے   تمام کالی بلائیں لپٹ گئیں سر سے

ہر ذرہ اپنی ذات سے ٹوٹا ہے اس طرح   ہر سمت آج پھیل گئی ہے انار کی

سرنگوں، چہرہ زرد، پاؤں فگار   ہر بشر آج اک سوال ہوا

یہ اشعار شمس بمن گرامی کی غزل نگاری کے طرز و مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں جذبہ و احساس کی چبھن بھی ہے، فکر و خیال کی گہرائی تخیل کی بلندی اور ذوق نظر کی پاکیزگی بھی اور اسلوب غزل کی روایتوں کو بھی فنی سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے۔ غزل نگاری کارِ سہل نہیں ہے، یہ زیادہ دشوار گزار اور پیچیدہ تر فنی شغل ہے، کیونکہ یہاں ایک ایک لفظ کی اہمیت اور قیمت ہے۔ چونکہ شعر کے دو مصرعوں میں ایک مکمل خیال کی ترسیل مقصود ہوتی ہے، اسلئے غزل نگار ایک ایک قدم پر احتیاط کو پیش نظر رکھتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کو فرسودہ رنگ میں برتنا کافی نہیں ہے، انکی نئے معنوی تہوں کو منظر عام پر لانا ضروری ہے۔ اسی لئے غزل نگار ایک غزل کے شعروں میں خیالات اور تاثرات کو منتقل کرنے کے دوران لفظ و اسلوب کو بھی تخلیقی انداز میں استعمال کرتا ہے تا کہ خیال و تاثیر میں تشنگی یا سکٹرن پیدا نہ ہو۔ چونکہ زندگی خود ایک تغیر پذیر قوت ہے، اسلئے ہر قدم پر تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں زندگی کا مزاج تبدیل ہوتا رہتا ہے، اسکے معاملات و مسائل بدلتے رہتے ہیں۔ غزل زندگی سے اٹوٹ رابطہ رکھتی ہے۔ اسلئے اسکے اشعار میں ان تبدیلیوں کا منعکس ہونا فطری ہے۔ یعنی یہ کہ زندگی کے مزاج کے پہلو بہ پہلو غزل کا مزاج بھی تبدیلیوں کے مرحلوں کو طے کرتا رہا ہے۔ شمس بمن گرامی کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی سامنے آجاتی ہے۔ انکے غزلیہ اسلوب میں فرسودگی نہیں ہے۔ انہوں نے روایتوں کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے عہد کے سماجی تغیرات کی مناسبت سے حقائق حیات کے شعور کو اپنے شعری اسلوب میں جذب کیا ہے۔ اسکی وجہ سے انکی غزلوں میں وہ کشش پیدا ہو گئی ہے جو حیات عصر کی توانائیوں سے مملو ہے۔ چونکہ غزل کے ذریعہ کیفیات قلب کی آئینہ سامانی ہوتی رہی ہے اور کیفیات قلب کا تعلق واردات عشق سے بھی رہا ہے۔ اسلئے شمس کی غزلوں میں عشقیہ سوز و گداز کا عنصر بھی موجود ہے۔ انہوں نے عشقیہ کیفیتوں کو بھی مصنوعی انداز میں پیش نہیں کیا ہے۔ سچے احساسات

کی مصوری کے دوران انہوں نے انسانی قدروں سے جذبۂ عشق کو وابستہ رکھا ہے۔کہیں کہیں عشق حقیقی کا رنگ بھی انکی غزلوں میں ہے جا بہ جا آہنگ اقبال کا اثر بھی موجود ہے۔جن کے اندر لب ولہجہ کی شادابی اور فکر واحساس کی تازگی موجود ہے مگر اپنی اس خصوصیت کو منفرد اور امتیازی مزاج بخشنے سے وہ قاصر رہے ہیں۔انکی غزلوں کے ان پہلوؤں کی وضاحت کیلئے چند منتخب غزلوں کے اشعار درج ذیل ہیں۔

★★★

انتخاب ازغزلیات

ہے شمس لائق تعزیر ماجرا کیا ہے　　قیام امن وسکون میں کوئی خطا کیا ہے

تو ہمات کی ایجاد فتنۂ تقدیر　　ہمیں بتائے کوئی شرح ماسعیٰ کیا ہے

ظہور ذرہ و خورشید حادثہ ہی سہی　　مگر تعین افلاک !ماجرا کیا ہے

★★★

سکون قلب کی ضد ہے خیال منزل کا　　جمال حق کی ہے سرحد یقین باطل کا

مواخذے نے محبت کو کردیا بدنام　　اُٹھا رہا ہوں قیامت میں رنج حاصل کا

متاع حُسن کی قیمت یہ کائنات سہی　　مطالبہ ہے مگر شمس آپ کے دل کا

★★★

شمس کنوئیں کی تھاہ نہ دیکھو پیاس بجھے گی پانی سے
مستعدی ہے شرط و گرنہ،رسّی چھوٹی ڈول گیا
معنی پیکر ڈھونڈ رہے تھے لفظوں کی انگنائی میں
اور ادھر وہ''ھو'' کا عالم جیسے الّو بول گیا

★★★

شمس نے جب اٹھالیا آئینہ حیات کو
قید نظر نے کرلیا، منظر شش جہات کو

مملکت خیال میں کون وہ خوش نصیب ہے
جسکی تلاش ازل سے ہے دیدۂ کائنات کو

نقطۂ انجماد پر وقت کی رو ٹھہر گئی
وجہ ثبات مل گئی گیتئ بے ثبات کو

لفظ ابھی بنا ہی تھا، ہر طرف آگ لگ گئی
کالی ہوائیں لے اُڑیں میری شکستہ بات کو

نفس ارتقاء پذیر جانے کہاں ہے اسکی حد
بخش دیا ہے اضطراب ذات نے خود صفات کو

قلب وجود چیر کر ایک لہو کی بوند میں
بند کیا ہے شمس نے سوزش کائنات کو

★★★

پناہیں ملیں جب نہ مفہوم کو
تو لفظوں کی قالین پر سو گیا

ٹھہر کر ازل، خود ابد بن گئی
ہر اک لہجہ، لمحے کا مُنہ دھو گیا

نشاں شہر احساس کا اب نہ پوچھ
وہاں منجمد ہو گیا، جو گیا

ہے مکڑی کا گھر گرچہ نازک بہت
مگر سیکڑوں سال کو ڈھو گیا

وہ ایک لفظ کہ جس کی ہے شرح کون و مکاں
تھرک رہا ہے فضائے بسیط پر اب تک

حباب وقت نہ ہوتا تو بڑھ گیا ہوتا
فصیل شہر کے اس پار رہر بشر اب تک

کرن کی نوک پہ شبنم کی عافیت معلوم
کہانی ہو بھی ہو چکی ہوگی مختصر اب تک

★★★

میں نے چاہا تھا کہ خود کو بھی ذرا پہچان لوں
میز پر تھا شیشہ میرا منہہ چڑا کر رہ گیا
واپسی کی چاپ پچھ میں نے سنی تھی رات کو
کون تھا؟ دروازے ہی کو کھٹکھٹا کر رہ گیا

جھانکتی تھیں روزنِ در سے شعاعیں زرد زرد
اپنے گھر کا ذرہ ذرہ تلملا کر رہ گیا
اک کبوتر اڑتے اڑتے تار پر بیٹھا ہی تھا
پھر وہ بیچارہ وہیں پر پھڑ پھڑا کر رہ گیا

شاخ سے ٹوٹی نہ تھی پتی کہ لے بھاگی ہوا
شمس ہے مجبور کتنا مسکرا کر رہ گیا

★★★

بطنِ ''لا'' سے یوں تو ابھریں سیکڑوں شکلیں مگر
اک شررِ نا آفریدہ، عالمِ حسرت میں ہے

وقت نے ادراک کا در وا کیا تو کیا کیا
ہر قدم زنجیر میں ہے، ہر نفس وحشت میں ہے

آنکھ اپنی دید کو محتاجِ آئینہ ہوئی
شیشہ گر نے جب سے دیکھا ہے مجھے، حیرت میں ہے

سادھوؤں تک کو بھی دیکھا ہے سنورتے شمسؔ نے
خودنمائی کچھ نہ کچھ ہر شخص کی فطرت میں ہے

★★★

زمین سے سورج کی تشنہ کرنیں نشاں مرے گھر کا پوچھتی تھیں
ادھر رگوں میں لہو کے قطرے نہ جانے کیوں کسمسا رہے تھے
اندھیری شب میں سیاہ کتے، تلاشتے تھے نفس کی لاشیں
ہماری دہلیز کانپ اٹھی کہ سب اسی سمت آرہے تھے
یہ کس نے پھر کُن فکاں کی لئے شکستہ سانسوں سے پھونک ماری
ابھی تو امکان کے دشت میں ہم پتا خود اپنا لگا رہے تھے
نگاہ کی ان گنت زبانیں بڑے تکلف سے چاٹتی تھیں
ہوا وہ تہہ خانہ ختم جس میں ہم اپنے خود کو چھپا رہے تھے

★★★

خدا تری سوعنایتوں میں عنایت اک انحراف بھی ہے
پرانی راہوں سے ہٹ کے چلنا مہم بھی ہے انکشاف بھی ہے
ہزار شیشوں سے جو گزر کر ہمارے شیشے میں آکے ٹھہرا
وہ قبلۂ کائنات بھی ہے، اگرچہ وقفِ طواف بھی ہے

ہواؤں کی کانپتی روش پر بکھر پڑے دھڑکنوں کے ٹکڑے
سمجھتے ہیں جس کو حادثہ ہم، وہ حادثوں کا غلاف بھی ہے
ہماری سانسوں کی بانسری سے نکل رہے ہیں شکستہ نالے
مذاق اسلوب ہی خود اپنے وجود کا اعتراف بھی ہے
چٹان لمحوں کی گھائیوں سے گزر کے ریتوں میں ہوگئی گم
وہ لئے جو جاتی ہے لامکاں کو، وہ گنجلک بھی ہے صاف بھی ہے

★★★

اپنا بوجھ ہوا نے جب ہم پر دے پٹکا
چونک اٹھا آکاش لگا دھرتی کو جھٹکا
کیوں نہ جگہ دوں میں طوفان کو اپنے در پر
آ پہنچا ہے ایک مسافر بھولا بھٹکا
زور آندھی کا نیچے کھائی، میں پربت پر
دیکھ رہا ہوں کرتب ڈوری پر اک نٹ کا
میں، گم گشتہ ڈھونڈھوں کہاں کہاں اب
ڈھیر لگا ہے، ہر جانب کوڑا کرکٹ کا
لاکھ ہوائیں طنزوں کے پتھر برسائیں
شمس کچھ اپنا سر بھی نہیں مٹی کا مٹکا

★★★

اگر اپنے قلب کا حوصلہ دمِ جستجو نہ فنا ہوا
تو وہ دشت گم شدہ ذات کا کفِ پا ہی سے ہے ملا ہوا
جو بہک چلی وہ نسیم تھی جو لپک اٹھی وہ سموم تھی
مگر ان کے غمزۂ ناز سے چمن آج تک ہے ڈرا ہوا

تیری بخششیں مرے ظرف کو ہمہ وقت بھانپ رہی ہیں کیوں
دل اگر چہ کوزۂ گل سہی، مگر آگ میں ہے تپا ہوا

وہ خرد کہ جس پہ فریفتہ یہ مکاں بھی ہے یہ زماں بھی ہے
جو سمجھ سکیں تو خودی ہوئی نہ سمجھ سکیں تو خدا ہوا

مجھے کیوں ہو فکر شکستگی کہ بگڑ بگڑ کے بنا ہوں میں
ہے ازل ہی سے مری ذات کا یہی سلسلہ لگا ہوا

★★★

جو گرد اُڑے تو کچھ اندازۂ جہات بھی ہو
تلاش خود میں روانہ مری حیات بھی ہو

ہوا اُڑاتی رہی شام ہی سے گرد وغبار
حواس باختہ تنہائیوں کی رات بھی ہو

اٹھی وہ موج تمنا کہ ہم بھنور میں پھنسے
کوئی ہماری طرح غرق حادثات بھی ہو

وجود لمحہ،اگر بطن لمحہ سے ہے عیاں
تو شمس بہر خدا شرح ممکنات بھی ہو

★★★

ابھی تو دم نہیں توڑا کسی نے   دھواں کیوں اٹھ رہا ہے ہر مکاں سے
ہوا کے دوش پر خبریں اُڑیں گی   لہو رِستا ہے پتھر کی زباں سے
بیابانو! مجھے بھی جذب کرلو   نکل بھاگا ہوں اپنے کارواں سے
تذبذب کی گھپا ہے اور میں ہوں   رہا ہوتا ہوں کب قید زماں سے

★★★

دھوپ ابھی کیاری کو چھو پائی نہ تھی
خواہشوں کی کونپلیں مرجھا گئیں

خون میں بس کر ہوائیں شہر کی
اب مری دہلیز تک بھی آ گئیں

مر دمک میں چھپ گئی حق بیں نظر
ہر طرف درسی کتابیں چھا گئیں

اک گلی کے موڑ پر کل رات کچھ
اجنبی پرچھائیاں ٹکرا گئیں

★★★

دُوری سبب قطع تعلق نہیں ہوتی
ہے ربط نہاں بحر کو شبنم سے گہر سے

جب ہے دل ہر ذرہ تری جلوہ گہہ ناز
کیوں حسن دل افروز تو پنہاں ہے نظر سے

گردش میں نہیں چرخ یہ آہوں کا دھواں ہے
کچھ دل جلے گذرے ہیں ابھی راہ گذر سے

★★★

ایک بوند جو میری جبیں سے ٹپکی تھی
گلوں کی روح عدم میں اسی پہ لپکی تھی
تمام اثاثہ اسی بیچ لُٹ گیا گھر کا
ذرا سی دیر کو میری جو آنکھ جھپکی تھی
بھنور کی گود میں نیند آ گئی زمانے کو
بڑے ہی پیار سے موجوں نے پیٹھ تھپکی تھی
سرک گئی تو رگ جاں سے آگ پھوٹ پڑی
نہ جانے کون سی شئے تھی جو آ کے چپکی تھی
نہ اٹھ رہے تھے بگولے حصار صحرا سے
وہ گرم سانس کسی مبتلائے تپ کی تھی

★★★

نہیں کہ مجھ کو زمانے کا اعتبار نہیں
نفس اسیر ہوں خود پر بھی اختیار نہیں

فلک کی سمت اُڑی جا رہی خاک مری
یہ گرد باد گرفتار انتشار نہیں

ہزار وادیٔ صبر آزما سے ہم گذرے
ہنوز پائے تجسّس اُفق کے پار نہیں

ہوا کہاں سے لہو کی مہک اُڑا لائی
کہیں اسی کے جگر میں تو کوئی خار نہیں

ہماری دشت نوردی کو ٹمّن نام نہ دو
یہ ملک وہ ہے جہاں بندش حصار نہیں

★★★

پرچھائیوں کے شہر کی تنویر گھٹ گئی
جب بھی کوئی چراغ جلا لو سمٹ گئی

خوشبو ترے بدن کی وہ قاتل کہ الاماں
ناگن مرے وجود کو ڈس کے اُلٹ گئی

میں انتظار میں ہمہ تن چشم اور اُدھر
دہلیز ہی کو چوم کے بجلی پلٹ گئی

دو مختی سے پاؤں پر اک دشت بے پناہ
دھرتی ادھر فلک کی ادھر آنکھ پھٹ گئی

جو ہر حیات کا کفِ گردوں اچک گیا
اک چیل میرے ہاتھ کی روٹی جھپٹ گئی

★★★

وہم کا سایہ مرا جزوِ وجود
چھپ نہ جائے آگہی کا آفتاب

جو بھی چاہے شوق سے آ کر پڑھے
میں نے رکھ دی میز پر اپنی کتاب

جانے کیسا ربط ہم دونوں میں تھا
سانس ادھر اکھڑی ادھر پھوٹا حباب

شرم سے کٹ کٹ گئیں پگڈنڈیاں اس قدر تھا رہروؤں کا اضطراب

رات اک جگنو چمک کر رہ گیا کھو گیا گھر کے اندھیرے میں شہاب

وقت نے ہر قطرۂ خوں لے لیا ہو گیا بے باق اب میرا حساب

شمس کو شب بھر ڈراتا رہ گیا

بسترِ کمخواب کا خوں گشتہ خواب

★★★

کتنی پیشانیوں کی ضیاء چوس کر

آپکا سنگِ در آئینہ بن گیا

کتنے تہہ بند کی دھجیاں اُڑ گئیں

نفس کا کھیل تھا حادثہ بن گیا

چبھ گئیں کرچیاں وقت کے پاؤں میں

آج ہر ذرہ اک کربلا بن گیا

★★★

نہ سر اُٹھائے سمندر سے حادثہ کوئی

نہنگ موج کے رُخ پر ہے بلبلا کوئی

تمام دامنِ صحرا لہو لہان ہوا

اُلجھ پڑی ہے ببولوں میں فاختہ کوئی

چہار سمت بلا کا سکوت طاری ہے

نہ ہو کہیں سرِ تخلیق سانحہ کوئی

چٹک گیا ہے مرے سائبان کا سایہ

ہوا کے پاؤں کا پھوٹا ہے آبلہ کوئی

ادھر ہے دھند میں اپنا جہاز اور اُدھر
فریب اُچھال رہا ہے قطب نما کوئی

کوئی نفس کے درازوں کو پاٹ دے آکر
رہے رہے نہ رہے دہر میں خدا کوئی

زبانِ شمس پہ شکوہ نہیں زمانے کا
مگر کچھ اسکی طرح دکھ بھی جھیلتا کوئی

★★★

اتنی زہر آلود فضا ہے پیڑوں کا بھی دم گھٹتا ہے
لوگ کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں اور ہمارا گھر جلتا ہے
ورنہ وہیں مر جاتی ناگن خیر ہوا آنگن گونگا ہے
آگ لگی ہے کس کے تن میں کون سوئے دریا دوڑا ہے
شمس ندی میں ہاتھ نہ ڈالو
پانی میں سورج اُترا ہے

★★★

کل رات فرش پر جو مرا ہم جلیس تھا
عنوان حادثات بہ نفس نفیس تھا

دیکھا جو میں نے غور سے یادوں کی طاق پر
اک مصحفِ حیات بہ طرزِ سلیس تھا

اب کس نوائے وقت کے افسوں میں کھو گیا
احساس کائنات جو میرا انیس تھا

عرفان پائے آگہی کو بجز خاک کیا ملا
اے شمس کس قدر کفِ صحرا خسیس تھا

★★★

جسکے کارن آگ لگی ہے بستی بستی جنگل جنگل
وہ برہمن کیوں گھوم رہی ہے بستی بستی جنگل جنگل
دھرتی کا رس چاٹ رہی ہیں تشنہ ہوائیں بھوکی کرنیں
کالی چِتا ٹوٹ پڑی ہے بستی بستی جنگل جنگل

جنگل جھانک رہا ہے تخت زمیں سے خوں آشام کوئی ہنگامہ
زرد ہوا بھی گرم ہوئی ہے بستی بستی جنگل جنگل
چوس رہی ہیں خون رگوں سے فتنوں کی اامرئی جونکیں
راکششوں کی دھوم مچی ہے بستی بستی جنگل جنگل

میں اب اپنے خودکو لے کر کس گھر میں چھپ جاؤں جا کر
بدروحوں کی فوج کھڑی ہے بستی بستی جنگل جنگل
شمسؔ فضا میں وِش کی لہریں کس مستی میں رینگ رہی ہیں
اک ناگن کیا چال چلی ہے بستی بستی جنگل جنگل

★★★

دیکھا جو سطحِ آب کی کائی کو چھیڑ کر خوں ناب تھا شباہت انساں لئے ہوئے
اک بار اسے بھی دیکھ جو ملبوں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے حسرت ساماں لئے ہوئے
اپنی کتاب دل کو نمائش میں کیا رکھوں ہر صفحہ ہے نقوش پریشاں لئے ہوئے

★★★

یہ کون ناگن ہواؤں میں زہر اُگل رہی ہے
کہ میری رگ رگ میں آگ کی لہر اُبل رہی ہے

زمانہ کیوں آرہا ہے جلتے پہ گھی چھڑکنے
مکاں کی چھت تو خود اپنے اندر سے جل رہی ہے

یہ اصل کی ہے پکار یا وقت کا تقاضا
ہمالیہ کی بلند چوٹی پگھل رہی ہے

مزاج پرسی کو رفتہ رفتہ سحر بھی آئی
مرے ہیولیٰ کو ظلمتِ شب نگل رہی ہے

کوئی ابھا گا ادھر سے بھاگا نہ جا رہا ہو
گلی گلی میں ہوا بڑی تیز چل رہی ہے

★★★

تلاش ہر کہنہ کی ہمیں ہے، اک اپنے خود پر نظر نہیں کچھ
بھنور کی تہہ کو تو پا ہی لیتے، نصیب غواص اگر نہیں کچھ

جہاں تہاں کچھ مہیب پنجر تھرک رہے ہیں سمئے کے دھن پر
مگر اداس اس قدر ہے منظر گھٹاؤں پر بھی اثر نہیں کچھ

مکاں کی بنیاد اسی پہ ٹھہری خمیر جس کا دھواں دھواں ہے
سلگ اٹھے گی کب آگ تہہ میں، نفس کی رو معتبر نہیں کچھ

بہت سی راہیں بدل چکا ہوں کہ جلد سے جلد تم کو پاؤں
ہوس نے جو راہ اب دکھائی وہ راہ بھی مختصر نہیں کچھ

سڑک کنارے نظر تو آیا ببول کا ایک درخت آخر
وگر نہ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ مدعائے سفر نہیں کچھ

خرد نے آنسو بہت بہائے قلم نے جی بھر کے خون اُگلا
مگر کوئی فصل اُگے تو کیوں کر یہاں تو مٹی ہی تر نہیں کچھ

★★★

کشتی پہ میری ذات ہی مستول ہو گئی
ہر سانس پاراترنے کا محصول ہو گئی

شرح وجود،نطق خرد،بزم آتشیں
بولا شرر کے بحث بہت طول ہو گئی

ہے وقت کا کمال کہ فطرت کی برہمی
اونچی چٹان ریت بنی،دھول ہو گئی

میں نے ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ بزم کی
کرسی جو پائدار تھی،معزول ہوگئی

میں نے ازل کے روز جو کھینچی تھی ایک آہ
وہ اب ہوا کے پیٹھ پہ منقول ہو گئی

★★★

منظومات

احمد حسین شمس بمن گرامی کی نظم نگاری،عصری شعور واحساس سے عبارت ہے۔انہوں نے اپنی نظموں کے موضوعات اپنے عہد کی شخصی اور سماجی زندگی کے واقعاتی نشیب وفراز سے اخذ کئے۔سماجی سرگرمیوں،آویزشوں اور مسائل حیات کی یورشوں اور الجھنوں نے انسانی معاشرے پر جو گہرے اثرات مرتسم کئے،شمس کی نظمیں انکی ترجمانی کرتی ہیں۔انہوں نے زندگی کے تغیر پذیر حالات کا مطالعہ ومشاہدہ سطحی انداز میں نہیں کیا ہے بلکہ وہ شخصی طور پران معاملات ومسائل میں شریک بھی رہے ہیں۔انسانی محرومیوں اور مسرتوں کوانہوں نے شدت سے محسوس کیا ہے اور اپنے حسی ردعمل کوسلیقے سے نظموں میں پیش کرنے کی کاوشیں کی ہیں۔زندگی کا یہ گہرااور واضح شعور دراصل ترقی پسندتحریک ہی کے زیراثر نمایاں ہوا ہے۔ڈاکٹر محمد حسن کے خیالات قابل توجہ ہیں:۔

''ترقی پسند تحریک نے اردو ادب میں ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ رومانیت نے ادب کو حقیقت سے دور تاثرات کی ماورائی دلدل میں پھنسا دیا تھا۔ رومانی ادیبوں کے نغموں میں رنگ و نور تھا۔ انکی کہانیوں میں صنوبر کے سائے اور غیر ارضی حسن کی پرچھائیاں تھیں۔ انکی تنقید الفاظ اور ہئیت کے طلسم میں غوطہ لگاتی اور جمالیات کے موتی نکالتی تھی۔ اختر شیرانی حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر بجنوری کی روایات ایک عظیم ورثہ ہے لیکن یہ جاگیر اپنے قرضہ ساتھ لائی تھی اور یہ قرض ترقی پسندوں نے ادا کیا۔ ترقی پسند تحریک نے پہلی بار صاف لفظوں میں ادب کو آسمانی صحیفہ قرار دینے کی بجائے اس سماجی مسائل کے ادراک اور انکے حل کرنے کا ذریعہ بنایا'' (ادبی تنقید ۹۵)

ڈاکٹر محمد حسن کے درج بالا خیالات کے تمام پہلوؤں سے تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا لیکن ان خیالات کے بعض نکتے بہر حال اہمیت رکھتے ہیں۔ انکا یہ تصور کہ ترقی پسند تحریک نے پہلی بار ادب کو سماجی مسائل کی پیشکش کا وسیلہ بنایا، درست نہیں۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے، انفرادی کاوشوں سے قطع نظر سرسید نے اپنی اصلاحی تحریک کے ذریعہ شعر وادب سے مقصدیت اور افادیت کی جس گہری وابستگی پر زور دیا تھا۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر وادب میں سماجی پیشکش پر سرسید اور انکے متعدد رفیقان عصر و تحریک نے زور دیا تھا۔ جن میں حالی، نذیر احمد اور شبلی کی شخصیتیں امتیازی طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ ترقی پسند تحریک نے بعض ایسے نکتوں کی نشاندہی کی اور ان پر زور دیا، جن کے سلسلہ میں سرسید کی اصلاحی تحریک کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً طبقاتی سماج کی اقتصادی ناہمواریوں سے پنپنے والی پیچیدگیوں اور محرومیوں پر انہوں نے اپنی توجہ مرکوز رکھی اور سماجی انصاف و مساوات کیلئے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی دعوت دی۔ روایات سے برگشتگی اور حقیقت نگاری کے میلانات انکے یہاں زیادہ حاوی رہے۔ اس انداز نظر نے بعض کمزوریوں کو بھی جنم دیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقمطراز ہیں:۔

''اس کا (ترقی پسند تحریک کا) بنیادی مرکز خیال ایک ایسا سیاسی نظام تھا جو اشترا
کی نظام کی تقلید تھا۔ ترقی پسند شعراء اور مصنفین نے سیاسی انقلاب کا مطلب صرف یہ سمجھ
لیا کہ جاگیرداری، سرمایہ داری معاشی اور اقتصادی استحصال، بھوک، افلاس اور مذہبی
اجارہ داری کے خلاف جنگ کی جائے۔ بے شک اس سیاسی نظام میں جو اس وقت رائج
تھا، ایسی خرابیاں تھیں جنکے خلاف جہاد ضروری تھا، لیکن اشتراکیت مسائل کا حل تو نہیں۔''

(اردو ادب کی ایک صدی ۱۵۰)

نئے انداز میں سوچنے پر شعرائے عصر اسلئے مجبور ہوئے کہ انکے عہد کے حالات
نئے ہیں۔ جو پیچیدگیاں اور الجھنیں۔ محرومیاں اور مایوسیاں عہد میں موجود ہیں، وہ اس
سے پہلے نہیں تھیں، علوم وفنون میں اتنی وسعت نہ آئی تھی، مشینی اور تکنیکی تجربات نے
انسانی زندگی کو اس طرح کے مسائل سے ہمکنار نہیں رکھا تھا۔ صنعتی تہذیب کے
تصادمات نمایاں ہیں اور تلخ تر سچائیوں کے تضادات بھی واضح ہیں۔ غیر یقینی حالات نے
انسانی زندگی کو دکھ سکھ کا ایک نیا شعور بخشا ہے، حیات عصر کی ایک تازہ بصیرت دی ہے۔

احمد حسین شمس بمن گرامی کی نظمیں بھی اس دور نو کے تجرباتی شعور سے آراستہ
ہیں۔ انکی نظموں میں متعلقہ دور کی تجرباتی سچائیوں کے اثرات منعکس ہوتے ہیں۔ اپنے
تاثرات کو شاعر نے احساس کی صداقت اور جذبے کے پُرخلوص توانائی سے ہم آہنگ
رکھا ہے۔ ان نظموں کے موضوعات میں بھی ندرت ہے اور اسلوب وتکنیک میں بھی
جدت ہے۔ جابہ جا ہندی شاعری کے مزاج اور اسلوب سے استفادے کا میلان بھی
ہے۔ جس نے شمس کے نظمی اسلوب میں حلاوت وشیرینی کی ایک خاص کیفیت پیدا کر دی
ہے۔ ان کی ترقی پسندی، اشتراکی نقطۂ نظر کی حامل نہیں ہے۔ انکے یہاں مارکسی خیالات
کا غلبہ نہیں ہے، انہوں نے طبقاتی تفاوتوں اور اقتصادی ناہمواریوں کے شکوے نہیں کئے
ہیں ان باتوں کے برعکس احمد حسین شمس کی نظموں میں قومیت پسندی حب الوطنی کا شعور
ہے اور عصری زندگی کی سخت وتلخ سچائیوں سے پنپنے والے ردعمل کا گہرا احساس۔ انسان

دوستی کا جذبہ بھی نمایاں ہے اور مسلمہ تہذیبی اور اخلاقی روایات کے زوال کا شکوہ بھی۔ نظم
"جلتے خیموں کی چیخ" کے یہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

سڑک پر کہیں لاش عریاں پڑی ہے
وہیں ایک معصوم بچی کھڑی ہے
بہت لیڈروں کی دھما چوکڑی ہے
مگر جس طرف دیکھئے گڑبڑی ہے

کہیں گرم بازار عصمت فروشی
کہیں شور ہنگامۂ بادہ نوشی

تشدد کا ہے ہر جگہ بول بالا
صداقت کو ہر دل نے دل سے نکالا
ہیں ویران مسجد، کلیسا، شوالہ
عزازیل نے راج گویا سنبھالا

یہاں گاندھیت کا مذاق اڑ رہا ہے
سررشتہ فاشزم سے جڑ رہا ہے

آزادی کے بعد گویا ہمارے قومی معاشرے کی تمام روایتیں بتدریج منہدم ہوتی چلی گئیں۔ سکون وعافیت کی جگہ انتشار وتصادم نے لے لی۔ ہر ایک شعبۂ زندگی اضطراب والتہاب میں مبتلا ہو گیا۔ رشتوں کی معنویت بکھرنے لگی اور ہر مرحلے میں پیکار وکشمکش کا زوال آمادہ مزاج نمایاں ہونے لگا۔ اسی نظم کے یہ بند دیکھیں۔

کہیں گائے کا ذکر آنے پہ جھگڑا
کہیں ڈھول باجا بجانے پہ جھگڑا
کہیں ووٹ دینے دلانے پہ جھگڑا
کہیں مہرہ آگے بڑھانے پہ جھگڑا

بصد شوق لڑتے ہیں شاطر لڑائی
کہ ہے چند سیٹوں کی خاطر لڑائی

عجب حال تعلیم کا بھی ہوا ہے
کہ استاد لڑکوں کا نوکر بنا ہے
کبھی پیٹھ پر اسکی پتھر لگا ہے
کبھی اسکے سینے پہ خنجر چلا ہے

یہ تو قیر استادکی ہورہی ہے
یہ تعمیر بنیاد کی ہو رہی ہے

شمس نے اپنی اس طویل نظم میں اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کی تمام تفصیلات پیش کردی ہیں۔ یہ محض مشاہدات نہیں ہیں اس عہد کے تجربات ہیں۔ان میں واقعیت ہے،احساس کی سچائی ہےاور انسانی قدروں سے گہری ہمدردی کا شعور ہے۔ شمس کی ان نظموں کے مطالعہ سے وضاحت ہوتی ہے کہ انہوں نے روایت سے رشتہ توڑا نہیں ہے۔ بلکہ روایت کو اپنے تجرباتی شعور اور تخلیقی بصیرت کے وسیلے سے آگے بڑھایا ہے۔موضوعات کی جدت وندرت کو برقرار رکھنے اور بااثر بنانے کیلئے انہوں نے اپنے اسلوب وتکنیک کو وضع بھی کیا ہےاور خوبصورتی سے ان کو استعمال بھی کیا ہے۔ان معنوں میں شمس بھی ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔البتہ اشتراکی نقطۂ نظر کے حامل ترقی پسند شاعروں کی طرح انہوں نے مارکسی اندازنظر کی بالادستی قبول نہیں کی ہے۔نظم ''کنور سنگھ'' شمس کی ملک دوستی اور قومیت پسندی کی بہترین مثال ہے۔بعض نظموں کے آہنگ پر اقبال کا اثر بھی واضح ہے۔جسکی ایک بہترین مثال نظم ''یقینِ محکم'' ہے۔اس کا پہلا بند ہے

منتظر اہل دل،میکدۂ کائنات | بادہ کشوں کیلئے ایک ہے دن ہو کہ رات
مطربِ خوشنوا بزم خودی میں نہ چھیڑ | نغمۂ غم آفریں،سطوت رفتہ کی بات
اہل ہمم کیلئے دعوت فکر وعمل | گردش لیل ونہار سلسلۂ حادثات

ہمت مرداں بے شرط آج بھی ہے موجزن　　　پردۂ ظلمات میں چشمۂ آب حیات
آج بھی ہے نعرہ زن اہل جنوں دم بہ دم　　　عزم بشرط خودی زیر قدم کائنات
چرخ کی پہنائیاں بھول تو سکتی نہیں　　　عرش بریں پر ہیں نقش نقشۂ پائے حیات

وہم نہیں کائنات ٹھوس حقیقت سمجھ
جنگ وجدل وقت سے مرد کی عظمت سمجھ

شمس کی ان نظموں میں عصری اور سماجی زندگی کے قومی معاملات ومسائل سے نپٹنے والا شعور بھی گویا نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ حالی واقبال کی قومی دردمندی اور ملت پسندی کے احساسات کا آہنگ کلام شمس میں موجود ہے۔ معاشرے کی عوامی زندگی کو تلخیوں اور کربناک اذیتوں سے ہمکنار کرنے والے اسباب وعلل کا مشاہدہ شمس نے پُر خلوص انداز میں کیا ہے۔ انکی شاعرانہ بصیرت عوامی معاشرے کے دکھ سکھ کو جذب کرنے میں بخوبی کامیاب ہوئی۔ انہوں نے نہ خواب وخیال کی باتوں کو موضوع بنایا ہے، نہ مثالیت پسندانہ راہ اختیار کی ہے اور نہ جذباتیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انکی نظموں میں ایک سنبھالا ہوا تخلیقی شعور موجود ہے جو انسانی تجربوں کی تہوں میں اترنے کی کاوشیں کرتا ہے اور حیات انسانی کے دکھ سکھ سے اپنے ہمدردانہ رابطے کا اظہار کرتا ہے۔ مضامین وموضوعات کی نوعیت ہی کے اعتبار سے شمس نے اپنی نظموں کے سانچے وضع کئے ہیں۔ چنانچہ لفظ واسلوب کے اعتبار سے بھی انکے یہاں ایک شعور تازہ موجود ہے۔ شمس کی یہ نظمیں ایک ذہین ذکی الحس شاعر کی حسی کیفیات کو نہایت احتیاط واہتمام کے ساتھ منظر عام پر لاتی ہیں۔ کہیں کہیں نظمی اسلوب میں کھردراپن محسوس ہوتا ہے۔ ہندی الفاظ کے استعمال اور ہندی شاعری کے مزاج سے استفادے کا میلان ان نظموں کے آہنگ ومزاج میں ایک خاص ندرت پیدا کرنے کا سبب ہوا ہے۔ وضاحت کیلئے شمس کی چند منتخب نظمیں پیش ہیں۔

★★★

انتخاب از منظومات

"احساس خودی"

اک شیر سے اک دن کسی روباہ نے پوچھا
اے مملکت دشت و بیاباں کے شہنشاہ
حضرت ہی کو جنگل کی ملی بادشہی کیوں
سب جانور اس دشت کے ہیں بندۂ اللہ

اس بات کو سنتے ہی ہنسی شیر کو آئی
بولا کہ ہے اظہار خودی تمکنت شاہ
حیرت تری طفلانہ کلامی پہ ہے مجھ کو
افسوس تو اس راز سے اب تک نہیں آگاہ

جسکی ہے نظر خالق کونین پہ ہردم
ہے اسکے لئے وسعت افلاک بھی کوتاہ
جس قوم کا دل ہمت و غیرت کا ہو مخزن
اس قوم کا ہر خورد و کلاں ہے اسد اللہ

آزاد اگر دل ہے تو مسلک بھی ہے آزاد
محکوم اگر دل ہے تو قسمت بھی ہے گمراہ
جرات ہو جگر میں تو ثریا بھی ہے پامال
بازو میں ہو قوت تو ہے کہسار بھی پرکاہ

بیباک نظر نام ہے احساس خودی کا
ممنون ہیں اس لفظ کے شان و حشم و جاہ

بزدل تو کریمی کا کرشمہ ہی سمجھ لے
مل جائے اگر راہ میں مردار بھی ناگاہ

پس خوردۂ اغیار سے نفرت مری فطرت
پس خوردۂ اغیار سے اوروں کو بڑی چاہ
بازو کی ہے سوگند کہ پس خوردہ جو کھائے
وہ شیر نہیں، شیر کی صورت میں ہے روباہ

آجائے سمجھ میں اسے اسرار حکومت
اسرار غلامی سے کوئی ہو اگر آگاہ

★★★

بنت عمران

فقیر ہوں کہ غنی سب نثار ہیں تم پر
تمہارے نور سے جلتی ہے شمع ہر گھر میں
تمہاری ذات وہ قدسی صفات ہے گویا
خدا نے ڈھال دی عصمت بشر کے پیکر میں

وہ برگزیدہ تمہارا وجود جسکے طفیل
یروشلم کے چراغوں نے روشنی پائی
وہ روشنی کہ سردار جب چمک اٹھی
تو کائنات کی ہر شئے نے زندگی پائی

تمہاری کوکھ سے خود پریم نے جنم لے کر
جب آشنائے محبت کیا زمانے کو

تو روح جاگ اٹھی اپنے خواب غفلت سے
دعائیں دیتی ہوئی ناصری گھرانے کو

وہ ناصرہ کہ فرشتوں کی آنکھ تھی جس پر
کہ اس زمیں سے رواں چشمۂ ھدیٰ ہوگا
زمانہ اس کو سمجھنے میں دیر اگرچہ کرے
مگر وہ پیکر حق، مظہر خدا ہوگا

تمہارے واسطے روح القدس بہ نفس نفیس
اتر کے چرخ بریں سے زمین پر آئے
بصد نیاز بصد احترام آخر شب
خدا کی روح فلک سے اتار کر لائے

تمہارے دامن معصوم کا مآل ہے یہ
بغیر باپ کے فرزند ہو! کمال ہے یہ

وہ ذات کلمۂ داور بقول یوحنا
کلام ازل میں، کلام از خدا، کلام خدا
وہی کلام مقدس وہی حیات عزیز
وہی بعظمت انساں وہی بنام خدا

وہی جو چرخ پہ تھا نور جاوداں بن کر
اتر پڑا ہے منجی عاصیاں بن کے
کرشمہ ہو چمن ہست و بود کا مریم
کہ معجزہ ہو خود اپنے وجود کا مریم
تمھیں سلام تمھارے سپوت پہ ہو سلام

★★★

ظہورقدسی

(۱)

رات خاموشی تھی، مغموم تھی، کچھ سہمی ہوئی
اس نے اک خواب بھیانک دیکھا
اور پھر چیخ اُٹھی
شکنیں چرخ کے چہرے پہ نمودار ہوئیں
خوف سے لرزہ براندام ہوا صحن زمیں
کانپ اٹھے دشت وجبل
بحرظلمات میں طوفان وتلاطم آیا
آگ برسانے لگی بادسموم
چونکہ معصوم سی اک رات نے دیکھا تھا کوئی خواب بھیانک
اور پھر چیخ اٹھی تھی ڈر کر۔

(۲)

چندعفریت مسلّح ڈاکو
برچھیاں تانے کھینچے تولے
جنکے چہروں پہ مچلتی تھی زحل کی سازش
جنکی آنکھوں میں لپکتی تھی جہنم کی زباں
اک نحوست کی شبیہہ
ناگہاں ایک نے برچھی کی انی
رات کے سینۂ نازک میں چبھودی بڑھ کر

پھر وہ بے بس سی مجروح ہرن کی مانند
نازک اندام کبوتر کی طرح
چھٹپٹانے لگی اور اسکی زباں چیخ اٹھی
کانپ اُٹھے دشت وجبل

(۳)

صحن گیتی پہ کروڑوں تارے
چرخ سے ٹوٹ کے موتی کی طرح فرش ہوئے
دوستو! تم انہیں شبنم کہہ لو
دوستو! تم انہیں آنسو کہہ لو

(۴)

دور کچھ دور ادھر
لرزشیں ریت کے تودوں میں ہوئیں
اور کچھ نقطے حبابوں کی طرح
سر اٹھانے لگے سہمے سہمے
آہ! وہ نقطے نہ تھے
سر تھے وہ ننھے مُنّے
رات نے اپنی نگاہوں سے انہیں
دفن ہوتے ہوئے خود دیکھا تھا

زندہ جاوید وجود
قرۃالعین بنی آدم کے
اور ہر بار ادھر رات کی زخمی آنکھیں

فرط دہشت سے لرز جاتی تھیں
ایسا محسوس اسے ہوتا تھا
کسی عفریت کی برچھی کی انی
اسکی پہلو میں ترازو ہو جائے

(۵)

منظر آنکھوں میں سما جاتے ہیں
لاشعور ان کو اک الماری میں
سینت لیتا ہے کہ شاید کبھی کام آ جائیں
تم اسے وہم کہو
تم اسے خواب کہو
خواب اور وہم حقیقت ہی کی پرچھائیں ہیں

(۶)

چرخ سے ایک ستارہ ٹوٹا
ٹوٹ کر فرش زمیں کو چھو کر
پھر سوئے چرخ بریں لوٹ گیا
جاتے جاتے مگر اک بات کہی
چند ہی ساعتوں میں
منبع نور وہی منتظر ارض وسما،
ہونے والا ہے طلوع

(۷)

پو پھٹی مرغ سحر نے دی اذاں

اور ادھر
اک عفیفہ کے مقدس لب پر
مسکراہٹ بصد انداز ہوئی جلوہ نما
آسماں پر ملکوتی نغمے
اس ترنم سے فرشتوں نے خوشی میں گائے
عرش تک جھوم اٹھا
شانتی چشمِ خلاء سے برسی

★★★

لرزتی پرچھائیاں

(۱)

راج ہنس دو پنکھ پسارے
نیل گگن میں تیر رہا ہے
اور ادھر اک بھوکا بیادھا
اک زہریلا تیر دھنک میں جوڑ رہا ہے

(۲)

اُتھل پُتھل ہو رہی ہے دھرتی
آج کہیں سے ٹوٹ گئی کیا اسکی دھوری؟
رات سُنا تھا میں نے بھی اک سخت تڑاخا
بھوت، پریت، جنات، چڑیلیں
شمشانوں میں، ایوانوں میں

مندر، مسجد، گرجا گھر کے قبرستانوں میں
ناچ رہے ہیں۔

(۳)

اور آدمی۔۔۔۔۔۔۔۔!
سہما سہما لرزاں لرزاں
اک کونے میں دبک کے بیٹھا
جھانک رہا ہے
آنے والے سورج کی خونیں کرنوں کو
انسانی خونوں سے لت پت
دستِ سحر کو
اور ہوا سے ٹپک رہی ہیں
غم نصیب شبنم کی بوندیں
دھرتی کی زخمی چھاتی پر

(۴)

(مُکھ ملین ہوگیا مرے چند اماموں کا
اسکی سگی بہن کی کوکھ
مسلسل پلوتو کچل رہا ہے شاید)

(۵)

ٹھیک اسی وقت ایک برہمن نے
اپنے سینے کا سارا زور لگا کر
سنکھ بجایا

ایک موذن بھی چلّایا، گلا پھاڑ کر
ٹن ٹن بج اٹھیں گھنٹیاں
گرجاؤں کی
اور اسی وقت ایک ببر نے ایک ہرنی کو پچھاڑ امارا
جس کے دو معصوم کھلونے
اس منظر کی تاب نہ لاکر
وہیں ڈھیر ہو گئے زمیں پر

(۶)

کس دکھیا کی آہ فلک سے جاٹکرائی
کہ آج لاکھوں شہاب ثاقب ٹوٹ رہے ہیں
اور بدھا تا کے چہرے پر گرم پسینے چھوٹ رہے ہیں
کیا راون نے پھر ستونتی سیتا کے
ہرنے کی سازش کر رکھی ہے
اور ادھر کچھ پاگل کتے
وسندھرا کی ریڑھ کی ہڈی توڑ توڑ کر چبا رہے ہیں

(۹)

اُتھل پُتھل ہو رہی ہے دھرتی
اسکی دھوری آج کہیں سے
ٹوٹ گئی ہے

★★★

کرب کا شعور

(۱)

فلک کی سمت شب نے یوں اچھال دیں کثافتیں
کہ دامن خلا، کثیف سے کثیف تر ہوا
کثافتوں نے ڈھک لیا فضا کو اس حساب سے
سراغ تک لطافتوں کا ہو گیا قرآن زہرہ و زحل
حیات کی نگاہ تک
نہفتہ وجود ہے خود اپنے ہی وجود میں

(۲)

وہ ظلمتوں کا زور ہے
کہ چرخ سے زمین تک شعاع نور لاپتہ
غلاف ایک چھا گیا کعبۂ حیات پر
بھٹک رہی ہے کائنات
اپنی جستجو میں خود
جبین سجدہ ریز بھی اداس اداس ہو گئی

(۳)

سکون و انقباض کا
حصار تنگ ہو گیا
شکستہ ہو گئیں حدود صبر و اضطراب کی
سرسوتی کا چہرۂ جمیل تمتما اٹھا

بہ جوشِ انتقام اس نے دفعتاً
رباب اپنے ہاتھ میں اُٹھا لیا
وہ تار جس پہ آج تک
خود اسکی نازک انگلیاں
پڑی نہ تھیں
جھٹک کے جھنجھنا اُٹھا
زمیں کی میخ ہل گئی
گگن میں تہلکہ مچا
تو جبرئیل کی زبان پکار اٹھی
ٹھہر ـــــ ٹھہر
وگرنہ اک شرر خدانخواستہ وجود میں جو آ گیا
تو پھر یہ کائنات اسی جگہ سمٹ کے آ گئی
جہاں سے وہ چلی تھی کل

(۴)

ادھر مرے قلم کی روشنائیاں
اُبل پڑیں
خیال منتشر ہوا
مری نظر کے سامنے
ہزار صد ہزار جگنوؤں کا اک ہجوم تھا
کہ یہ شرارِ ذی حیات اُبھر پڑے ہیں
ظلمتوں،

کثافتوں،
غلاظتوں کی کوکھ سے؟
خیال انتشار سے سمٹ کے صفر بن گیا
وہ صفر
جسکے بیچ مسکرا اُٹھا
شعور مرے کرب کا

★★★

ایک حرف کی تلاش

گرچہ ٹھیک اسکی نظر کے سامنے
تُل رہے ہیں کاسئہ سر وقت کی میزان میں
ڈائنیں مرگھٹ میں جا کر چوستی ہیں ہڈیاں
جھیل کی چادر پہ جمتے جا رہے ہیں
صد ہزار آنکھوں کے میل
چیل اپنے گھونسلے میں نوچتی ہے خشک گوشت
پھر بھی ہے گمبھیر کتنا آسماں
آبلے آکاش کے تلووں میں ابھرے تھے بہت
تیر کی مانند اک روشن لکیر
چھوتی آئی نظر صحن خلاء میں
چند لمحے وفضا میں کھلبلی سی چھا گئی
پھر وہی گمبھیرتا آکاش کی
پھر مری آنکھوں نے اک دن

بھاگتے دیکھا بھی تھا
سانس تھی آکاش کی اُکھڑی ہوئی
اور اسکے پیچھے اک آوارہ کتا
اس قدر بھونکا کہ دھرتی کانپ اُٹھی
اور پھر
بیچ چوراہے پہ دونوں میں تصادم ہوگیا
اور ادھر
بڑھ گئی آکاش کی گمبھیرتا
پھیپھڑے کا زور سارا آزما کر میں بھی چیخا
چیخ لیکن چیخ ہی بن کر رہی
چند لمحوں کیلئے ماحول چونکا تھا ضرور
پھر مری جانب کسی نے
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا
کون ہے
کیوں چیختا ہے!
بزدلی آکاش کی گمبھیرتا بڑھتی رہی
اور میں اس حرف کو پڑھنے لگا
جس کو میں نے خود لکھا تھا ریت پر
کاف تھا
یا الام
کچھ پتہ چلتا نہیں

★ ★ ★

جل رہا ہوں میں خود اپنی آگ میں

میں نہ جانے کب سے مصروف سفر ہوں
جھاڑیوں کے بیچ ہو کر
ایک پگڈنڈی ہے بَل کھاتی ہوئی
جس پہ میرے نقش پا بن بن کے مٹتے جا رہے ہیں
اک ذرا میں نے جو دیکھا پیچھے مُڑ کے
وہ زمیں جس پر تھی پگڈنڈی مری
صفحۂ ہستی ہی سے معدوم تھی

ہاں مگر
کچھ منحنی پرچھائیاں
وقت کی تاریکیوں میں
جگنوؤں کی طرح جلتی بجھتی آتی تھیں نظر
میں نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں
سامنے کیا دیکھتا ہوں
اُڑ رہی ہیں تتلیاں ہر رنگ کی مستانہ وار
اور کچھ ان سے پرے
مہ وشوں، زہرہ جبینوں، گلرخوں کی ٹولیاں
لے رہی ہیں دم بہ دم تو بہ شکن انگڑائیاں
اور ادھر میرے جگر میں
ناگہاں

جذبات کے شعلوں نے بل چل ڈال دی

چاہتا ہوں

ان پری چہروں کو میں تارِ نظر میں باندھ لوں
تتلیوں کو قید کر لوں مجلسِ ادراک میں

دوڑتا ہوں میں ادھر بے ساختہ

اور ادھر

ہر صبح کا خورشید

میرے رہگذر میں

جھاڑتا ہے

خندۂ تضحیک کی چنگاریاں
چل رہا ہوں خود اپنی آگ پر
جل رہا ہوں میں خود اپنی آگ میں

★★★

اگنی چکر

ابھی تو کچھ ہی دور چلے تھے
آوازوں کی ان نگری جانے کتنی دور ابھی تھی

اور تمناؤں کی پریاں
قلبِ تجسس کو پیہم ورغلا رہی تھیں
فکر و نظر کے اضطراب نے

جوڑ دئے تھے

ادھر ہمارے پاتوں میں وہ پنکھ ہوا کے
ادھر ہماری تیز روی کو
لگا اچانک ایک دھچکا
بیچ راہ میں
دہک رہی تھی آگ مگر دائرہ بنائے
ہم نے چاہا پھلانگ جائیں اس چکر کو حواس خمسہ کے بل بوتے
لیکن ہوش ہمیں جب آیا
اس چکر کے بیچوں بیچ کھڑے تھے ہم چپ چاپ اکیلے
مرکز کا لامرئی نقطہ
چپک گیا تھا اک تلوے سے
کچھ گدگدی اٹھی تلوے میں
اک سہرن سی دوڑ گئی سارے تن من میں
کچھ مدہوشی کی سی لذت دماغ میں چھائی جاتی تھی
مگر ناگہاں
لگا ہمارا تلوا جلنے
لگی رینگنے تیز آنچ ناگن کی صورت
گرم لہو تلوے سے رس رس کر دھرتی کی تشنہ کوکھ میں سمارہے تھے
اور دائرہ سمٹ رہا تھا
چشم زدن میں
ہم بھی تھے جزو اسی اگنی چکر کے

★ ★ ★

بازگشت

(۱)

دھرتی سے گڑگڑا کے کہا میں نے ایک دن
اے ماں وسندھرے! مرے گھر کو سنبھال دے
محنت سے روز روز کی تنگ آ گیا ہوں میں
اب تو ہی اپنے دل کے خزانے نکال دے
دھرتی نے مسکرا کے کہا۔ اے خودی فروش
جاپابستہ خیال وطلبگار نائے نوش
چاہوں تو میں اگل دوں خزانے ابھی مگر
فردوس بھی ملے تو نہ لے بھیک آدمی
اس سے وقار غیر تو بڑھ جائیگا ضرور
لیکن ترے وقار میں آجائے گی کمی

(۲)

اپنی جبیں سے گرم پسینے کو پونچھ کر
دہقان نے ڈالی چرخ پہ حسرت بھری نگاہ
ماحول وہ کہ میری غریبی پہ خندہ زن
تقدیر وہ کہ ہو نہ سکی اپنی خیر خواہ
پہ چلچلاتی دھوپ، زمیں گرم لو کی لہر
ہے کس گناہ کی یہ سزا اے مرے اللہ
اک اڑ رہی تھی شہد کی مکھی ٹھہر گئی

بولی کہ اے کسان زراعت کے بادشاہ
ہوتی ہے جب عمل میں محبت کی سروری
دیتی ہے تب سکون کی دیوی ہمیں پناہ
تم اور ہم ہیں زندہ کسی اور کیلئے
محنت نہیں عذاب، محبت نہیں گناہ

★★★

ناتراشیدہ بُت

صنم کہ جسکی تلاش میں کائنات کی
آنکھ ہے پریشاں
وہ کس گپھا میں چھپا ہوا ہے؟
اسی گپھا کی اگر اڑیں دھجیاں ہوا میں
تو دہر شاید سکون پائے
لگا اچانک قلم کو جھٹکا
زمین شاید لرز رہی ہے
پہاڑ کی اک چٹان ٹوٹی
کچھ اوپر اچھلی
وہاں سے ناگاہ تھرتھرا کر گری
تو آ کر
ٹھہر گئی سبزہ زار میں وہ
ہماری آنکھوں نے اس میں دیکھا

کنول پہ اک اپسرا کھڑی ہے

بصد ہزاروں اداو عشوہ

حیات افشاں تبسم اسکے لبوں پہ رقصاں

ادھر جبین نیاز اپنی

وفور سجدہ سے مضطرب ہے

ادھر ہے تسکین خودنمائی

لہو میں غلطاں، یہ انگلیاں کس بُت تراش کی ہیں

دلیل فردوس تشنگی ہے

تلاش انجام زندگی ہے

ہماری ہستی اگر ہے مایا

نصیب اپنا اگر ہے تحریر کلک قدرت

ہوا کرے اس سے کچھ نہ ہوگا

انا خود اپنی تلاش میں ہے

انا جواب تک خود اپنی ہستی سے بے خبر ہے

جبیں کی اک آرزو کے صدقے

لہولہان انگلیاں کسی بُت تراش کی ہیں

★★★

ضمیر کا پچھتاوا

راون ابھرا نیچ بھنور سے

اپنی آن پہ مر مٹنے کو

ہند مہا ساگر میں پھر سونے کی لنکا ڈوب نہ جائے

اور ادھر میں

کس کندھا میں

سرپ نکھا کو ڈھونڈ رہا ہوں

وہ متوالی چھیل چھبیلی

بربس من کو ہرنے والی

فتنۂ محشر

عصمت لنکا

عزت راون

قلب جہاں کی دھڑکن بن کر

اٹھلاتی بل کھاتی جانے کس ایون میں گھوم رہی ہے

کیوپڈ یوں اندھا ہے لیکن

اس کا تیر اچوک نشانہ جس کو چاہے زخمی کر دے

راج کنور ہو یا بیراگی

جوگن ہو یا راجکماری

ستیہ بان ہو یا ساوتری

سب کے سب گھائل ہیں اسکے

ایسے لوگوں کو میں نے پاگل ہوتے بھی دیکھا ہے

گلیوں گلیوں

جنگل جنگل

تن من سے بے سدھ ہو کر مارے مارے پھرتے دیکھا

کئی جیالے ہنستے ہنستے

جھول گئے پھانسی کے پھندے گلے لگا کر

آجاؤ اب آجاؤ

میں نے مانا سیتا کے دیوانے ظلم وستم کے رسیا

لو میں آج معافی مانگ رہا ہوں تم سے

اُور سے دنیا بھر کے مردوں کی

انہیں خدا ارا

چھما دان کر دو تم آکر

ورنہ نہیں نہ گاہ تمہاری ضد کے کارن

ہند مہا ساگر میں پھر سونے کی لنکا ڈوب نہ جائے

★★★

وسویس

آگ اسی تہہ خانے میں لگ گئی ناگہاں
دھرتی نے جس جگہ چھپا رکھے تھے اپنے زر و جواہر
سونا چاندی پگھل رہے ہیں
وسویس کا بند دہانہ
من ہی من کسمسا رہا ہے
خدا نہ کردہ
دھرتی کا پھٹ پڑے کلیجہ
اور اچانک
سانس وقت کی
گرم لہو کا فوارہ بن کر لہرائے!
رہ جائیں گے اسرافیل اپنے ہاتھوں میں صور سنبھالے
اور قیامت پھوٹ پڑیگی تحت ثریٰ سے
(شہری اپنے ایوانو کی
دہقان اپنی جھونپڑیوں کی
خیر منائیں)

در، در، در،
دستک دیتی سمّی ہوائیں
شاید یہ مسموم ہوائیں
ڈھونڈ رہی ہیں اس پاپی کو
جس نے آگ لگائی ہے
اقدار وانا کے گنجینے میں

★★★

قطعات

اضاف شاعری میں قطعہ گوئی کی روایت قدیم نوعیت کی حامل ہے۔قطعہ بند غزلیں بھی کہی جاتی رہی ہیں اور قطعہ نگاری کی جداگانہ روش بھی رہی ہے۔قطعہ کیلئے کم ازکم چارمصرعوں کی شرط ہے۔زیادہ اشعار کی کوئی حدمقرر نہیں ہے،لیکن اسکی کاوش ضرور کی جاتی ہے کہ ایک مکمل خیال کی ادائیگی کیلئے اتنے ہی اشعار استعمال کئے جائیں جتنے ضروری ہیں۔

قطعوں کے اشعار مربوط ومسلسل ہوتے ہیں۔خیال کے ارتقائی تسلسل کوفنی سلیقے سے بیان کیا جاتا ہے۔موضوعات کی کوئی تخصیص نہیں۔قطعہ نگار،اپنے مشاہدات اورتجربات سے پنپنے والے تاثرات کوجامعیت کالحاظ رکھتے ہوئے قلمبند کرتا ہے۔قطعے کے ابتدائی اشعار میں موضوع سخن کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اور بتدریج موضوع سے متعلق خیال ارتقائی مرحلوں کو طئے کرتا جاتا ہے۔قطعہ نگار،زندگی سے متعلق تمام مسائل ومعاملات پر گہری نظر رکھتا ہے۔اسکی باریک بینی اور جزرسی،زندگی کی حقیقتوں کا مکمل ادراک حاصل کرتی ہے۔وہ شخصی تاثرات کوبھی بیان کرتا ہے اور خارجی زندگی کے موضوعات کوبھی شعری پیرائے میں منتقل کرتا ہے۔

احمد حسین شمس کے قطعات کے مطالعے سے وضاحت ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعرانہ بصیرت اور دانشورانہ صلاحیت کا اظہار نہایت سلیقے سے کیا ہے۔انکے قطعات میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور تجربات ومشاہدات کی بوقلمونی بھی۔ان قطعوں میں مضامین وخیالات کی بلندی کے ساتھ ساتھ جذبہ احساس کی روشنی بھی ہے۔یہی خصوصیت انکی معنویت اور معنوی تاثیر کونمایاں کرتی ہے۔شمس نے شخص اور

معاشرتی زندگی کے تجربوں اور تجرباتی صداقتوں کو اس خوش اسلوبی سے قلمبند کیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ قاری کے اندر تحریک فکر پیدا ہوتی ہے بلکہ اسکے جذبہ واحساس میں گدگدی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔حیات ارضی کی کئی بنیادی حقیقتوں کے واضح ادراک نے ان قطعات کی معنویت میں گہرائی پیدا کردی ہے اور انکی فضائے احساس بھی کشش انگیز بن گئی ہے۔کہیں بھی دنیا بیزاری حیات بیزاری کا منفی میلان نہیں ملتا۔زندگی کی سچائیوں سے انحراف کا رجحان یہاں نہیں ہے۔اسکے برعکس اثبات حیات کی معنی خیز توانائی ان قطعوں میں موجود ہے۔کہیں کہیں غیر اہم نکتوں کے اہم حوالہ سے بھی شمس نے قیمتی فکر واحساس کا مظاہرہ کیا ہے۔دنیاوی زندگی کے متعلقات کے سلسلہ میں مثبت رویہ کے باوجود شمس رمن گرامی نے دنیاداری اور دنیا طلبی کے میلان کی نفی کی ہے۔ان کے پیش نظر انسانی زندگی کی اعلیٰ اور صالح قدریں رہی ہیں اور انہوں نے اقدار حیات ہی کے حفظ وبقاء کو اہمیت دی ہے۔انسانی تجربوں کی تلخیوں اور سختیوں کے ردعمل میں اضمحلال و مایوسی کی جو کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے، شمس نے اس پر قابو پانے اور عزم وعمل سے کام لینے کی تلقین بھی کی ہے۔عصری زندگی کی کربناک اذیتوں کو انہوں نے شدت سے محسوس تو کیا ہے، مگر ان اذیتوں سے گھبرا کر حوصلۂ حیات سے محروم ہو جانے کو وہ بہت ہی غیر مستحسن تصور کرتے ہیں۔ان اوصاف کی وضاحت کیلئے انکے قطعات سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

★★★

انتخاب از قطعات

انسان کو ماحول سے اک جنگ ہے پیہم
طاقت جو نہیں خاک میں، ہے وقعت آدم
دنیا کو اگر زیر کیا تم نے تو فردوس
دنیا سے اگر زیر ہوئے تم تو جہنم

حرکت ہی نہ ہو ان میں تو یہ خامہ وشمشیر
اک تو سن پابستہ ہے،اک شیر بہ زنجیر
تیمور سے اک چھوٹی چیونٹی نے کہا تھا
ہے سعئی مسلسل سے بشر حاکم تقدیر

یہ ذرے یہ خورشید، یہ مہتاب، یہ تارے
ہر لحظ کئے جاتے ہیں خاموش اشارے
رشتہ جو نہ ہو، دانہ و تسبیح بکھر جائیں
کونین ہے قائم اسی رشتے کے سہارے

مایوس اگر دل ہے تو قطرہ بھی ہے سیلاب
ہو عزم مصمم تو سمندر بھی ہے پایاب
مدت سے قدم چومنے کو اہل ہمم کے
بے کل تھے سر چرخ بریں،زہرہ ومہتاب

اونچا ہے سر اس واسطے مخلوق کے اندر
یہ بندہ خالق نہ جھکے غیر کے در پر
برتر ہے ملک سے نہ فقط عقل کے باعث
غیرت کے بغیر آدمی،حیوان سے بدتر

سورج نے کہا چاند ستاروں سے بہ تاکید
اک نفئی خودی،اصل میں ہے مقصد توحید

لیکن بہ خدا شمس یہی سوچ رہا ہے
خورشید میں ذرہ ہے کہ ذرے میں ہے خورشید

ادنیٰ یہ کرشمہ ہے تری عشوہ گری کا
پردہ مری آنکھوں سے اٹھا بے خبری کا
دیکھا تو اِک اِک ذرہ میں اِک شمس ہے روشن
جب چور ہوا شیشہ مری خود نگری کا

کیوں مرد مجاہد بھلا بندۂ تقدیر
سر شارمئے عشق ہے وہ پیکر تدبیر
مستی ہو نہاں دل میں تو چشتی کی خودی ہے
آنکھوں سے اُبل جائے تو محمود کی شمشیر

جس سمت نظر ڈالو بس اک آگ لگی ہے
جس دل پہ رکھو ہاتھ جلن پھوٹ رہی ہے
ہے عقل کے ہر شہر میں ہنگامۂ محشر
اک عشق کی بستی ہے کہ سنسان پڑی ہے

ایمان وعمل لازم وملزوم ہیں ورنہ
یوں ہوتے ہیں اسٹیج پہ ہرفن کے اداکار
تم بھانج تو سکتے ہو مگر لڑ نہیں سکتے
قبضے میں تمہارے ہو اگر کاٹھ کی تلوار

ایوان حکومت میں تو قانون کی بہتان
میدان سیاست میں فقط خون کی بہتان
مذہب کی عمل گاہ کو جب جھانک کے دیکھا
تقریر کی بوچھار ہے، افیون کی بہتان

دہشت بہ خدا اصل میں اک شرک خفی ہے

صاف اسکے یہ معنی ہیں کہ ایماں کی کمی ہے
قلت بھی کوئی لفظ ہے شیروں کی لغت میں
کثرت سے وہ خائف ہو جو محروم خودی ہے

گلگشت پہ آئیں تو شگوفے بھی مچل جائیں
پرواز پہ اتریں تو ستارے بھی دہل جائیں
مٹھی میں ہے انسان کی سررشتہ تقدیر
جس سمت ہو خواہش، ہم اسی سمت نکل جائیں

مذہب پہ فدا ہے مگر ایمان نہیں ہے
مورت بہت اچھی ہے مگر جان نہیں ہے
حیرت تو اسی پہ ہے کہ انسان کے اندر
شیطاں ہے، ملک ہے مگر انسان نہیں ہے

تاریک گپھاؤں میں صدا ڈوب گئی ہے
گرداب میں حسرت کے دعا ڈوب گئی ہے
انسان تو باہر ہی رہا اور ندی میں
ہر شخص کی تصویر انا ڈوب گئی ہے

محصور تمنا ہوں گرفتار بلا ہوں
گو احسن تقویم کے سانچے میں ڈھلا ہوں
سنسان سڑک، دھوپ کڑی باد مخالف
اک بوجھ لئے سر پہ اکیلا ہی چلا ہوں

کس کھوہ میں خوابیدہ ہے وہ پیکر خود دار
اے ہم نفسو! شمس کو آواز تو دینا
مرجائیں گے یہ زاغ وزغن خوف کے مارے
شاہیں کو ذرا فرصت پرواز تو دینا

★★★

کنڈلیاں

احمد حسین شمس بمن گرامی نے ہندی شاعری کے مزاج واسلوب سے جو گہرا اثر قبول کیا ہے، اسکی وضاحت انکی کنڈلیوں سے بخوبی ہوتی ہے۔انہوں نے متعدد خوبصورت، اثر انگیز اورفکر انگیز کنڈلیاں قلمبند کی ہیں۔ان میں انکا ہندوستانی ضمنیات سے استفادے کا میلان بھی موجود ہے۔جو ہندوستان کے مقامی تمدن وتہذیب سے وابستہ ہے۔لفظ وبیان میں بھی ہندی کا رنگ نمایاں ہے۔ہندوستان کی ضمنیاتی روایات اور ہندی زبان سے گہری وابستگی اور واقفیت اور ان عناصر کے برتاؤ نے شمس کی ان کنڈلیوں میں انوکھی تاثیر وکشش پیدا کردی ہے۔شمس نے ارضی زندگی کے معاملات وحالات کے پس منظر میں پنپنے والے اپنے شاعرانہ تاثرات کوخوبی وخوش اسلوبی سے ان کنڈلیوں میں منتقل کیا ہے۔سطوری اور تلمیحی اسلوب کی وجہ سے انکے اندر معنوی تہہ داری اور احساس وفکر کی نیرنگی پیدا ہوگئی ہے۔اردو شاعری میں کنڈلی نویسی کی یہ اولین روایت ہے۔شمس بمن گرامی کی یہ منظوم کاوشیں اس لئے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

شمس بمن گرامی کی ان کنڈلیوں کے مطالعے اور جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے دنیاوی زندگی کی صالح قدروں کی ترویج پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے۔جابجا صوفیانہ انداز نظر بھی موجود ہے۔فقر واستغنا، بے نیازی، ترک الذات، وفا کیشی اور زندگی کے رافع واعلیٰ نصب العین کی آئینہ داری کوانہوں نے اہمیت دی ہے۔ارضی اور سماجی زندگی کے ارفع وفراز سے پیدا ہونے والی تلخیوں اور اذیتوں کوانہوں نے انسان کی تقدیر تصور کیا ہے اور اس زندگی کی کامیابی وکامرانی کیلئے عزم وعمل کوایک بنیادی شرط قرار دی ہے۔موجودہ قومی معاشرے میں عام انسانوں کوجن سنگین مسائل حیات سے دوچار

ہے اور لیڈروں کی سیاسی بازیگری نے جن المناکیوں کو جنم دے رکھا ہے، شمس نے انکی عکاسی کے دوران واقعیت پسندی کی راہ اختیار کی ہے۔ کہیں کہیں انکی یہ واقعیت شعاری تلخ بھی ہوگئی ہے، اسکے باوجود اس میں قوت اثر موجود ہے۔ معاشرے میں عام طور پر فریب، جعل سازی، رشوت، منافع خوری، چور بازاری وغیرہ کا جو رجحان پایا جاتا ہے، شاعر نے اسکی بھی حقیقت پسندانہ مصوری کی ہے۔ اس نوعیت کی ان کنڈلیوں کے ذریعہ موجودہ معاشرے کی سچی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ذات پات اور مذہب وفرقہ کے نام پر انسانیت سوزی اور انسان کشی کی جو مہیب لہریں چلتی رہتی ہیں اور نام نہاد مذہبی رہنما صاف وسادہ عوام کی پرسکون زندگی میں فساد وفتنہ کی جو آگ لگاتے پھرتے ہیں، شمس بمن گرامی نے اسکی نشاندہی بھی کی ہے۔ گرانی اور بے روزگاری جیسے مسئلوں پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ مختصر یہ کہ شمس بمن گرامی کی یہ کنڈلیاں موجودہ دور کی عوامی اور سماجی زندگی کی مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان کے اندر صداقت نگاری بھی ہے اور عصری مسائل کی مکمل اور صحیح انعکاسی بھی۔

شاعرانہ لب ولہجہ میں کہیں کہیں طنز کا تیکھاپن بے حد نمایاں اور سریع الاثر ہوگیا ہے۔ اس خصوصیت کے ذریعہ شمس کے اصلاحی شعور پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی ان کنڈلیوں کے ذریعہ انہوں نے سماجی زندگی کی گمراہیوں، کوتاہیوں، خامیوں اور کمزوریوں کی اصلاح کرنے کی کاوش کی ہے۔ انکے شاعرانہ لب ولہجہ اور انداز نظر کی تائید کیلئے چند منتخب کنڈلیاں ملاحظہ فرمائیں۔

انتخاب از کنڈلیاں

بھور ہوئیں کلیاں کھلیں ہنسے چمن میں پھول
ہم پاپی ایسے ہوئے گئے کرم کو بھول
گئے کرم کو بھول پڑے ہم ٹانگ پسارے
کھڑکی اوٹ چکٹ ہو ہم کو سورج نہارے
کہہ مادھو کوی رائے کرم ہی نیم دھرم ہے
جاگ اٹھی جو قوم اسی کی جیب گرم ہے

سیٹھ سود، سرکار کر، نیتا مانگے ووٹ
ایک ڈھول پر دیکھئے تین کراری چوٹ
تین کراری چوٹ تڑا تڑ لاگے بھیا
جنتا ناچے کٹھپتلی اس تا تا تھیا
کہہ مادھو کوی رائے بکریا کیوں ممیائے
قربانی کی ٹھہری کب نوں خیر منائے

جنتا جورو دیش کی امریکہ ہے جیٹھ
دیور بن رس چوستے پنڈت، ملّا، سیٹھ
پنڈت ملّا سیٹھ بہت ہڑبونگ مچاویں
بھوجی کو ٹھگنے کے سوسو ڈھونگ رچاویں
کہہ مادھو کوی رائے کہاوت سچ ہے بھائی
ابرا کی جورو لاگے سب کی بھوجائی

بڑھ کر کوئی بھیکھ سے کام نہیں سرکار

جنتا کا مت دان لیں باہمن اور چمار
باہمن اور چمار ملیں آپس میں ایسے
نیر چھیر میں شمپین میں سوڈا جیسے
کہہ مادھو گوی رائے خبر لو اپنے سر کی
بڑی تیز قینچی ہے ان بھولے لیڈر کی

لیڈر کرے نہ چاکری، افسر کرے نہ کام
داس ملوکا، کہہ گئے سب کے داتا رام
سب کے داتا رام جھرو کے بیٹھ نہاریں
جنتا شور کرے تو گھونسہ کس کے ماریں
کہہ مادھو گوی رائے بھجن پانڑے جی گاویں
بھوکھوں مریں مجور، نکمے پاچک کھاویں

نیتا شچیوالے گئے، گئے شوالے سیٹھ
شان جتاویں کھوکھلی بولیں ہندی ٹھیٹھ
بولیں ہندی ٹھیٹھ، کہیں آنگن کو پرانگن
کن کرتبے ومڑھ ہوئے مندر بن اپوان
کہہ مادھو گوی رائے کمیشن لیں بک سیلر
شبد کوش بھگوان خریدیں، کاپی جیلر

شت پرتی شت وموڑھ ہے اسے نہ سمجھو سادھ
جرم ہے جو گھوس کو چوری کو اپرادھ
چوری کو اپرادھ اگر مانے کی دنیا
پنجرے سے اڑ جائے گی سونے کی منیا

کہہ مادھو کوی رائے سچائی جھوٹ بنے گی
چور بنو گھوس خور بنو تب سوٹ بنے گی

ایکتا کیسے ہوئے جب ایک نہ رام رحیم
پنڈت رسیا بھنگ کے مُلاّ کھائیں افیم
مُلاّ کھائیں افیم،نکالیں تجیا لمبا
پنڈت بھی تن جائیں سڑک پر گاڑے کھمبا
کہہ مادھو کوی رائے تماشا دیکھو بھائی
دو اندھے متوالوں نے کیا راڑ مچائی

دھن جوئے کے کھیل ہیں چھن آوت چھن جات
پنجا چھلّہ کیوں رہے؟ رہے ایک سو سات
رہے ایک سو سات کہ ہے جادوئی رتی
دھاکڑ نیل بنے ہیں پل بھر میں بکرا خصّی
کہہ مادھو کوی رائے بڑے گُن اس نمبر میں
دن کو بھی تارے دکھ پڑتے ہیں امبر میں

کتنے عالیشان ہیں مندر،مسجد،چرچ
سُنا بھون نرمان میں ہوئے ہزاروں خرچ
ہوئے ہزاروں خرچ لگے جنتا کو چندے
ادھر کبوتر مورکھ ادھر کپٹ کے پھندے
کہہ مادھو کوی رائے انوکھی چال ہماری
سر پھوڑیں بھگوان سنیما گئے پجاری

جن ڈھونڈا تن پائیاں چلتی گاڑی سیٹ

ہم بوری ٹیسن نی لیا کیچہ پیٹ
لیا کیچہ پیٹ ہمارے پاس ٹکٹ تھی
مگر دشا اس ٹمٹے گارڈ کی بڑی بکٹ تھی
کہہ مادھو کوی رائے انہیں کچھ پیسے دیدو
تمہیں ٹھونس دیں ابھی ٹرین میں جیسے بھی ہو

ناچ رہی ہیں ہرجگہ ڈائن،بھوت،چڑیل
مگر سیانے بن گئے منتریوں کے بیل
منتریوں کے بیل چریں دلّی میں جاکر
لوک سبھا کو بھی چکرا دیں چکر کھا کر
کہہ مادھو کوی رائے انوکھی راہزنی ہے
شیت لہر تک بھارت میں یمدوت بنی ہے

ماں چھمی کے دوار پر بھگت مناویں سوگ
مہنگائی اتنی بڑھی،کون چڑھاوے بھوگ
کون چڑھاوے بھوگ بھلا گھربار لٹا کر
چوہے پیل رہے ہیں ڈنڈ ہوا کھا کھا کر
کہہ مادھو کوی رائے گرانی کا ہی ایش ہے
مدھو شالہ،بس،ٹرین،سنیما میں جو رش ہے

نر ناری سب آم کو چوسیں دانت گڑائے
بھیّا میٹھے ملاحسن کو چاہئے یہی سزائے
چاہئے یہی سزائے کہ میٹھے منہ کا ہونا
متر بنا ہے لچّوں کو دے کر سونا

کہہ مادھو کوی رائے چپو چھی بابن کو
رکھو رام کو تاکھے پر دل میں راون کو

جہاں چال تہہ مال ہے، جہاں جال تہہ ماچھ
جہاں لوبھ تہہ راج ہے، جہاں بیج تہہ گاچھ
جہاں بیج تہہ گاچھ نکل آوے اندر سے
اگر چار سو بیس گھٹاؤں کا جل بر سے
کہہ مادھو کوی رائے گلگٹی ایک ہنر ہے
پاس پر کچھا کرو، کماؤ اگر عقل ہے

★★★

شمس بہ حیثیت نثر نگار

اردو کی نثری روایات میں فورٹ ولیم کالج کی تصنیفی سرگرمیوں کے وسیلے سے پہلی مرتبہ تنوع برپا ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے اردو نثر کو صاف و سادہ انداز تحریر سے آشنا کیا۔ اس سے پہلے تک نثری مزاج میں تصنع اور تکلف ہی کا رنگ حاوی تھا۔ نثر میں شاعری کی جاتی تھی اور اسلوب نثر کو قافیہ ردیف اور تشبیہات و استعارات سے آراستہ کر کے منظر عام پر لایا جاتا تھا۔ اس سے نثر نگاروں کی قادر البیانی تو نمایاں ہو جاتی تھی، نثری مزاج و اسلوب میں صفائی، سادگی اور عام فہمی نہ آپاتی تھی۔ زندگی کے عام مشاغل اور معاملات سے متعلق تفصیلات کو پیش کرنے کی صلاحیت اسکے اندر نہ تھی۔ حیدر بخش حیدری خلیل علی خاں اشک، بہادر علی حسینی، کاظم علی جواں اور للو جی لال جی وغیرہ فورٹ ولیم کالج کے ممتاز نثر نگار ہیں۔ طرز تحریر کی سادگی و عام فہمی کے اعتبار سے میر امن

دہلوی کو سب پر فوقیت حاصل ہوئی، جنکی تصنیفات ''گنج خوبی'' اور ''باغ و بہار'' نے نثر جدید کی اولین روایتوں کی تشکیل کی۔ ان نثری کاوشوں کے باوجود فورٹ ولیم کالج کے داستان ''فسانہ عجائب'' ہی کی زبان کو معیار تصور کیا جاتا رہا۔

۱۸۵۷ء کو ناکام جنگ آزادی کے کم و بیش دس برسوں کے بعد سرسید کا اصلاحی مزاج نمایاں ہوا اور بتدریج انکی اصلاحی فکر و نظر میں ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ انہوں نے رسالے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ اپنے اصلاحی تصورات و عزائم کو پیش کیا۔ سرسید نے خود جو مضامین و مقالات قلمبند کئے زبان و بیان اور موضوعی تنوع کے اعتبار سے انکی اہمیت ہے ہی، انہوں نے اپنے کئی رفیقان عصر کو بھی اپنی اس نثری تحریک میں شریک و شامل کیا۔ ذکا ء اللہ، مولوی چراغ علی، محسن الملک، نظام الملک، خواجہ حالی، نذیر احمد، شبلی اور بعض دوسرے نثر نگاروں نے سرسید کا اسلوبی مزاج اختیار کیا اور نثر کی اس جدید روایت کو کافی فروغ دیا۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرح کے مضامین و موضوعات اور خیالات و تاثرات نثر کے وسیلے سے پیش کئے جانے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں جدید، عام فہم اور صاف و سادہ نثر سے متعلق ایک وقیع ذخیرہ فراہم ہو گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اس نثری اسلوب کو قبولیت مل چکی تھی اور جیسے جیسے روشن خیالی پھیلی، ادبیات مغرب سے استفادے کے شعور کو اہمیت حاصل ہوئی، ویسے ویسے اردو نثر کے دامن میں وسعت آتی گئی۔ شاعری، تنقید، سوانح، صحافت نگاری، شخصیت نگاری، سیرت نویسی، تاریخ، مکتوب نگاری وغیرہ ادبی اسالیب نے اس دور میں نئی توانائی حاصل کی۔

ادب اور مقصدیت کے رشتوں میں وسعت آئی تو بیسویں صدی کے آغاز ہی سے شعر و ادب کے ذریعہ ہندوستان کے عوامی معاشرے میں حیات آفریں تغیرات برپا

کرنے کی کاوشوں میں ہمہ گیری آ گئی۔حب الوطنی،قوم پرستی،ملک دوستی،انسانیت نوازی اورعوام پسندی کے میلانات نمایاں ہونے لگے۔ہرصنف ادب اورتخلیقی اسلوب کوایک تازہ بصیرت حاصل ہوئی۔رفتہ رفتہ ترقی پسندانہ عناصر کی پرورش ہوتی رہی اور عوامی مفادات وحقوق کے استحصال کی سازشوں کے خلاف شعروادب کے وسیلے سے خیالات پیش کئے جانے لگے۔قومی اور سیاسی تحریکوں کوشعروادب کے ذریعہ اس دور میں بڑی تقویت حاصل ہوئی۔۱۹۰۸ء میں پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ''سوزوطن'' شائع ہوااوراسی سال اقبالؔ قیام یوروپ کے بعد واپس ہوئے۔ان دونوں ہی شخصیتوں نے فکشن اورشاعری کےمزاج واسلوب میں انقلاب برپا کردیا۔قومیت پسندی اورواقعیت برطانوی حکومت کے رجحان کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوگئی۔سوزوطن کی واقعیت پسندانہ تلخی پر برطانوی حکومت نے اشتعال انگریزی کاالزام عائد کیااوراسے ضبط کرلیا گیا۔لیکن پریم چند کی حقیقت نگاری جاری رہی۔انکا حلقئہ اثر بھی پھیلتا گیا۔شاعری میں اقبالؔ کے آہنگ کے اثرات بھی عام ہوتے گئے۔'تہذیب الاخلاق''،''اوراسکی صحافت نے'''،''زمانہ''،''کامریڈ''،''الہلال''،''البلاغ''اور''زمیندار''کے صحافتی اسلوب کا رنگ اختیار کیا۔ان رسائل واخبارات کے ذریعہ قومی اور معاشرتی زندگی کی فلاح واصلاح اورتعمیر وترقی کیلئے پرزور جدوجہد کی جانے لگی۔شعروادب کے لسانی مزاج اورانداز بیان ومزاج پربھی واضح اثرات مرتسم ہوتے گئے۔۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا باضابطہ آغاز ہواتو طرزتحریراورانداز نگارش میں اور وسعت آ گئی۔ترقی پسند ادیبوں کےکل ہند اجتماع کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں پریم چند نے جس واضح نقطۂ نظر کو پیش کیا تھا،وہ ذیل کی چند سطروں میں مرقوم ہے:۔

''ہماری انجمن (انجمن ترقی پسند مصنفین)ادب کوخمریت اور شبابیات کا دست نگر نہیں

دیکھنا چاہتی ۔وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے۔اسے زبان سے بحث نہیں ہے۔آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بہ خود سلیس ہو جاتی ہے۔حسن معنی ،آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔جوادیب ،امراء کا ہے وہ امراء کا طرز بیان اختیار کرتا ہے، جو عوام الناس کا ہے،وہ عوام کی زبان لکھتا ہے۔ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو ونما پا سکے۔''

(گفتگو بمبئی،ترقی پسند ادب نمبر ۲۶)

ترقی پسندوں نے اس نقطۂ نظر کو رہنما بنایا۔انہوں نے عوامی معاشرے کی فلاح و بہود کے مقاصد کو سامنے رکھ کر ایسے ادب کی تخلیق پر اصرار کیا جو عوام کا تھا اور عوام کیلئے تھا۔عوامی مسائل عوامی زندگی کے بنیادی تقاضوں اور عوامی دکھ درد کو انہوں نے واقعیت شعاری کے ساتھ پیش کیا۔اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کی تمام اصناف اور اسالیب میں ایک شعور تازہ نمایاں ہوا اور ملک گیر سطح پر اسکے اثرات پہنچنے لگے۔چونکہ احمد حسین شمس کی ذہنی نشو ونما اسی دور میں ہوئی اسی لئے فطری طور پر ان اثرات کو انہوں نے قبول کیا۔انکی نثری تحریروں کے جائزے اور مطالعے سے مترشح ہے کہ شمس نے ایک ایسی زبان اختیار و استعمال کی جو عام فہم تھی۔انکے لسانی مزاج میں وسیع المشربی ہے۔زبان و بیان میں سادگی و عام فہمی ہے۔انہوں نے اپنے عہد کی قومی اور سماجی زندگی کے معاملات و مسائل کا بغور مشاہدہ کیا اور ان سے پہنچنے والی کیفیت کو سادگی اور سچائی کے ساتھ اپنی نثری تحریروں میں منتقل کر دیا ہے۔

ناول

گذشتہ صفحات میں اسکی وضاحت کی جا چکی ہے کہ اصلاحی تحریک کے عہد میں اردو قصہ نگاری کے مزاج و اسلوب نے ایک حیات آفریں رُخ اختیار کیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے قصے اگر چہ تمثیلی انداز رکھتے ہیں۔ لیکن اولین نما قصوں میں پہلی مرتبہ سماجی زندگی کے حالات منعکس ہوئے تھے۔ ''مراۃ العروس''، ''بنات النعش'' اور ''ایامی'' سے لے کر ''ابن الوقت'' تک نذیر احمد کے تمام قصوں میں متعلقہ دور کی معاشرتی زندگی کے نقوش نمایاں ہیں اور قصوں میں تمثیلیت اور مقصدیت بہت ہی حاوی ہے، اس حد تک کہ ناول کو فروغ تو دیا ہے مگر ناول کے فن وفکر کی مکمل آئینہ داری مرزا رسوا کے ناول ''امراؤ جانِ ادا'' ہی میں ہو سکی جو ۱۸۹۹ء میں منظر عام پر آیا۔

مرزا رسوا کے ''امراؤ جانِ ادا'' کے بعد جیسے جیسے بیسویں صدی عیسوی میں مغربی علم و ادب کے اثرات نمایاں ہوتے گئے ناول نگاری کے مزاج و اسلوب میں بھی تنوع برپا ہوتا گیا۔ اس ضمن میں پریم چند کی شخصیت بطور خاص لائق تذکرہ ہے جنہوں نے اپنی ناول نگاری کا آغاز ''اسرار معابد'' سے کیا اور جنکا فن ''گئودان'' میں منزل کمال کو پہنچا۔ گئودان میں ہندوستان کی عظیم عوامی روایات کا مکمل انعکاس ہوا ہے۔ ہوری، گوبر اور دھنیا کے کردار ہندوستانی معاشرے کے تغیر پذیر حالات کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور گاؤں شہر کے ان معاملات و مسائل کی ترجمانی بھی، جن کا تعلق اس دور سے تھا۔ حقیقت نگاری کے بے پناہ شعور کا بہترین مظاہرہ اس ناول میں ہوا ہے۔ جلوۂ ایثار، بیوہ، بازار حسن، گوشۂ عافیت، نرملا، غبن، میدان عمل وغیرہ ناولوں کے ذریعہ پریم چند نے اردو ناول کے سرمائے میں زبردست اضافہ کیا۔ انکی تشکیل کردہ ناولی روایات نے ایک طویل عرصے تک اردو ناول نگاروں کے قافلے کی قیادت کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ترقی پسند

تحریک کے آغاز وفروغ عہد میں بھی پریم چند ہی کے ناولوں کا واقعیت شعارانہ رنگ حاوی رہا، بلکہ گئودان جیسا کوئی دوسرا ناول تو لکھا بھی نہ جا سکا۔ پروفیسر وقار عظیم اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''پریم چند کے ناول، اردو ناول کی تاریخ میں زندگی اور فن کی عظمت اور بلندی کے بہترین مظہر ہیں۔ پریم چند سے پہلے اچھے اچھے ناول نگاروں نے فن کی جو روایت قائم کی تھی، پریم چند نے نہ صرف اسے وسعت دی بلکہ ایسے امکانات کا حامل بنایا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا کوئی موقع اور فکری احساس اور جذب کی کوئی پیچیدگی اسکے لئے بیگانہ نہیں رہی۔ پریم چند کے ناول بہ یک وقت ٹالسٹائی کی وسیع النظری اور مزاج کی مردم شناسی کی حامل بھی ہیں اور مشرقی مزاج کے صحیح آئینہ دار بھی۔''

یہ درست ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نئے انداز و مزاج کے کئی ناول لکھے گئے۔لیکن پریم چند نے جو فکر و فن کا معیار بنایا تھا، کوئی اور ناول نگار اسکا مقابلہ کرتا نظر نہیں آتا۔حتی کہ کرشن چندکا ناول ''شکست'' میں بھی ذہنی تلذز پسندی کے عنصر کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔جسکی وجہ سے انکی واقعیت شعاری صحیح طور پر ابھر نہ سکی۔ پریم چند نے ناول نگاری کے موضوعات ہی میں تنوع پیدا نہیں کیا بلکہ اس صنف کو انسانی اور انسانی معاشرے کی خدمت گزاری کے لئے وقف کردیا۔اپنے عہد کی معاشرتی، اخلاقی، تہذیبی اور اقتصادی پیچیدگیوں اور الجھنوں کو شدت سے محسوس کیا تھا اور انسان دوستی کے گہرے اور پرخلوص جذبے کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کیا تھا۔ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کے ناولوں کے اس پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''پریم چند کے ذہنی اور فکری ارتقا کے سلسلہ میں یہ بات اہم ہے کہ جیسے جیسے ہندوستانی سماج کے بدلتے ہوئے طبقاتی کردار کے بارے میں انکی آگہی بڑھتی گئی انکی تخلیقی فکر پر جلا ہوتی گئی۔جیسے جیسے مظلوم اور پامال طبقوں سے انکی ہمدردی گہری ہوتی گئی فن پر بھی

انکی گرفت بڑھتی گئی۔ انکی تخلیقی قوت، انکے آدرشوں سے زیادہ سماجی اور تہذیبی حقائق پر اعتماد کرنے لگی۔''

یہی اعتماد ہے جس نے پریم چند کے ناولوں میں ایک حیات آفریں توانائی پیدا کردی اور اسی وجہ سے انکے ناولوں میں اتنا زور دار اثر رہا ہے کہ جس نے ترقی پسند عہد میں بھی پریم چند ہی کو ناول نگاروں کا میر کارواں بنائے رکھا۔ ترقی پسند تحریک کے دور آغاز ہی میں سجاد ظہیر کا مختصر ناول ''لندن کی ایک رات'' شائع ہوا۔ اسکی اہمیت کا اصل سبب یہ ہے کہ اسمیں پہلی مرتبہ شعور کی رو کی تکنیک کو جزوی طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اسی تکنیک کو کچھ عرصے کے بعد قرۃالعین حیدر نے زیادہ انہماک کے ساتھ ''میرے بھی صنم خانے'' میں استعمال کیا۔ عصمت چغتائی کے ناول ''ضدی'' ''ٹیڑھی لکیر'' کرشن چند کے ناول ''شکست'' اور عزیز احمد کے ناول ''گریز'' ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے ذریعہ اردو ناول کے نئے امکانات روشن ہوئے۔ ان میں سے بیشتر ناولوں میں متعلقہ کی انحطاط پذیر عام معاشرتی مسئلوں کی مصوری بھی ان میں واقعیت شعاری کے ساتھ کی گئی ہے۔ قدیم رنگ کے اصلاحی، اخلاقی، تاریخی، رومانی اور اسراری ناولوں سے انحراف کرتے ہوئے، عہد نو کی انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ان سے متعلق صداقتوں کو زیادہ انہماک کے ساتھ پیش کیا جانے لگا اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ناول بتدریج انسانی زندگی کی مختلف النوع سرگرمیوں کا امین و عکاس بنتا گیا۔

شمس بمن گرامی کے پہلے ناول ''نذرانہ'' میں زیر تذکرہ دور کی سوشلسٹ تحریکات کا واضح اثر موجود ہے۔ اسکی اشاعت ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی۔ زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی تلخ سچائیاں اس دور میں تیزی اور شدت کے ساتھ اپنا دائرہ واثر پھیلا رہی تھیں۔ ناول نگار نے ''نذرانہ'' میں ہندوستانی سماج کے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کی آئینہ سامانی، واقعیت شعاری کے ساتھ کی ہے۔ شمس نے اس ناول میں اسکی نشاندہی

بھی کی ہے کہ رسم ورواج میں جڑے ہوئے معاشرے کے ہر فرد کی زندگی، تلخ صداقتوں سے عبارت ہے۔ ناول کے منفی کرداروں میں واحد علی کا کردار ایک گہرا تاثر قائم کرتا ہے۔ اسکے کردار کی گندگی اور غلاظت دراصل اس نوعیت کے تمام افراد معاشرہ کی ذہنی پستی اور اخلاقی زوال کی آئینہ سامانی کرتی ہے۔ ناول میں شمس کے سیاسی تصورات بھی جابجا عیاں ہیں اسکے برعکس ناول'' حاتم بھائی'' طنز ومزاح کے عناصر سے آراستہ ہے جو رسالہ'' شان ہند'' میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ سماجی زندگی کی گمراہیوں اور فرسودہ خیالوں کو ناول نگار نے نہایت سلیقے سے طنز وظرافت کے اسلوب میں قلمبند کیا ہے۔ ناول ''اور سالگرہ آتی رہی'' میں بھی عام ہندوستانی زندگی کی تفصیلات کی سچی تصویریں موجود ہیں۔ شمس کی حقیقت نگاری نے انکے تمام ناولوں کو سماجی زندگی کے حقائق کا بہترین آئینہ خانہ بنادیا ہے۔'' نذرانہ'' میں انہوں نے دیہاتی زندگی کے جو مرقعے پیش کئے ہیں، انکے اندر اس عہد کی زندگی، ہنستی بولتی اور جیتی جاگتی زندگی منعکس ہوئی ہے۔ دیہاتی ماحول میں عام انسانوں کو دُکھ سکھ کی جن متضاد کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے، اسکی تصویریں، تکلف اور تصنع سے مبرا ہیں۔ تخیلات اور تصورات کی بالادستی یہاں نہیں ملتی۔ لیکن انکے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ فن وفکر کا امتزاج پوری طرح پیش نہ کر سکے۔ ان ناولوں میں واقعیت شعاری اور حقیقت نگاری تو ہے مگر فکر انگیز رمزیت نہیں ملتی۔ نفسیاتی عمق نظر نہیں آتا۔ ماحول رسم ورواج اور تہذیبی فضا کو ان کرداروں سے بخوبی ہم آہنگ نہیں کیا جاسکا۔ جو ناولوں کی واقعاتی لہروں میں بہتے، اُبھرتے اور ڈوبتے دکھلائی دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شمس نے زندگی کا تجربہ ومشاہدہ، انہماک وخلوص کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن اپنے تجربہ ومشاہدہ سے پہنچنے والے تاثرات کو ناول کے فنی تقاضوں سے قریب تر کر کے آگے بڑھنے میں ان کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ چونکہ ناول کے ذریعہ زندگی کی سچائیوں کی تصویر سطحی انداز میں نہیں پیش کی جاتی، ناول نگار، اپنے فن میں زندگی

کی تخلیق تو کرتا ہے اور تعبیر جدید دریافت کرتا ہے۔ اسلئے وہ انسانی معاشرے کے تمام دُکھ سکھ کو اپنے تخلیقی شعور میں جذب کرتا ہے اور پھر انکے ردِ عمل میں پنپنے والے تاثرات کو سلیقے اور خوش اسلوبی سے ناول کے فارم میں منتقل کرتا ہے۔ مسائل حیات کے سلسلہ میں اسکا ایک واضح نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے وہ فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ رالف فاکس (Rallf Fox) ناول کے فن کے بنیادی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"The novel deals with the individual, it is the epic of the struggle of the individual against society, against nature and it could only develop in a society where the balance between man and society was lost."

یعنی یہ کہ ناول فردی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ یہ سماج اور فطرت کے خلاف فردی جدوجہد کا رزمیہ ہے۔ یہ ایک ایسے ہی سماج میں ترقی کر سکتا ہے جہاں فرد اور سماج کا توازن گم ہو کر رہ گیا ہو، اور جہاں انسان اپنے گردوپیش کے افراد یا فطرت سے جنگ آزما ہو۔ ظاہر ہے کہ ناول نگاری کیلئے یہ صورت حال شمس بمن گرامی کے آس پاس تو رہی ہے لیکن اس صورتحال کو وہ ناول کے اس فنی سلیقے کے ساتھ پیش نہیں کر سکے، جسکا تقاضا رالف فاکس نے کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ناول نگار نے اپنے عہد کی شخصی اور سماجی زندگی کے حالات کی مصوری کی ہے، مگر یہ مصوری خام نوعیت رکھتی ہے۔ ناول کے مذکورہ اجزائے فن سے، انکے دلوں کی واقعاتی فضا، ہم آہنگ نہیں ہو سکی۔ انہوں نے اگر ناول کے فن کے لوازم کو برتنے کیلئے ریاضتوں سے کام لیا ہوتا تو انکے یہ ناول زیادہ توجہ طلب اور کشش انگیز بن جاتے اور فن کی تکمیل کا احساس بھی واضح ہو جاتا۔

تنقید

سرسید کے اصلاحی تحریک ہی کے عہد میں اردو تنقید نے ایک نئی کروٹ لی تھی اور ادبیات مغرب کے شعور تنقید سے استفادے کی میلان کی افادیت محسوس کی جانے لگی تھی۔ حالی اور پھر شبلی نے نظریاتی، عملی اور تقابلی تنقید کی روایات کی تشکیل کی اور پھر اسکا لازمی اثر یہ ہوا کہ بتدریج تذکروں کی روایت سے انحراف کر کے تنقید جدید کی روایتوں کو فروغ دینے کے رجحان کو تقویت حاصل ہوتی گئی۔ایک طویل وقفے تک انہیں تنقید نگاروں کی قائم کردہ روایتوں کی تقلید کی جاتی رہی۔ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو تخلیق کے پہلو بہ پہلو تنقید کا بھی نیا انداز سامنے آیا۔ نئے ادبی موضوعات اور اصناف واسالیب کے افہام و تفہیم کیلئے تنقید کے نئے پیمانے وضع ہوئے۔ادبی تخلیقات کے تقویم کے نئے تنقیدی معیار نے ایک ایسے تنقیدی مزاج واسلوب کو فروغ دیا جس میں تجزیاتی شعور نمایاں تھا۔قدیم ادبی تخلیقات کو بھی تنقید کے نئے پیمانوں میں وزن کیا جانے لگا۔ادبی تخلیقات کے مضامین وموضوعات کی قدر وقیمت متعین کی جانے لگی۔ترقی پسند تحریک ہی کے زمانہ آغاز وفروغ میں کلیم الدین احمد کی تنقیدی تحریریں اور تصنیفیں منظر عام پر آئیں جنہوں نے تنقید کے تقاضوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:۔

''تنقید کوئی کھیل نہیں ہے جسے ہر شخص بآسانی کھیل سکے۔یہ ایک فن ہے۔ایک صناعی ہے۔فن تو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔مشکل بھی اور آسان بھی۔تنقید ایک مشکل ترین فن ہے۔ ہر فن کی طرح اسکے بھی اصول وضوابط اور اغراض ومقاصد ہیں۔ادب اور زندگی اسکی مخصوص اور قیمتی جگہ ہے۔اسلئے ہر کس وناکس ایک نقاد کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد ۱۴)

ظاہر ہے کہ ''پارٹی پروگرام'' کو ادب وتنقید سے اسطرح وابستہ کردینا ہرگز مستحسن نہیں ہے۔تنقید نگار اگر جماعتی منصوبوں کا علم بردار بن جائے تو پھر ادبی تقاضوں کی تکمیل ممکن نہیں ہوگی۔ادب وتنقید کے تقاضوں کونظر انداز کر کے تنقید نگار اپنے فرائض کی ادائیگی میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔تنقید کا اصل مقصد ادبی تجربوں کو ادیبوں کے حوالہ سے سمجھانا اور سمجھنا ہے۔تنقید نگار ادبی تخلیقات کے محاسن معائب کی روشنی میں انکی قدرو قیمت دریافت کرتا ہے۔کسی خاص نقطۂ نظر کے تقاضوں کی تبلیغ وترویج اسکا مقصد نہیں ہوتا۔تنقید،نظریاتی وابستگی کے تقاضوں کی وکالت نہیں کرتی ہے۔لیکن اسکے لئے فنی معیار کی نشاندہی بیان کا حسین امتزاج ہے جوادبی تجربے کے حسن کومکمل کرتا ہے۔اسلئے تنقید نگاران تجربوں کے صوری اور معنوی،خارجی اورداخلی دونوں ہی پہلوؤں کے حسن وقبح کی دریافت کرتا ہے۔اس صورت میں اسکی تنقیدی تحریروں کے وزن واثر کومحسوس کیا جاسکتا ہے۔

شمس بمن گرامی نے زیر تذکرہ دور میں کئی ایسے مضامین لکھے جنکی تنقیدی بصیرت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔انہوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں کسی خاص نقطۂ نظر کی بالادستی کوقبول نہیں کیا ہے۔مارکسی خیالات اوراشتراکی نظریات کی مقلدانہ ترویج انہوں نے نہیں کی ہے اور نہ مغربی خیالات کو انہوں نے اپنے ناقدانہ شعور پر حاوی ہونے دیا ہے۔انکی تنقیدی تحریروں میں توازن فکر ونظر بھی ہے اور ادبی تقاضوں کی چھان بین کا شوق بھی۔انکے تجرباتی شعوراور تقویمی بصیرت نے انکی تحریروں کو لائق توجہ اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔انکی ناقدانہ عبارت آرائی الجھنوں کی حامل نہیں ہے۔انکے جملوں میں ابہام بھی نہیں ملتا اور یہ گنجلک بھی نہیں ہیں۔شمس بمن گرامی کے ناقدانہ مزاج کی یہ خوبیاں انکی تصنیف ''غالب کی باتیں'' کے مطالعہ کے دوران بخوبی سامنے آجاتی ہیں۔یہ سات

مضامین پر مشتمل ہے۔لیکن اس کا موضوع دراصل کلام غالبؔ ہی ہے۔غالبؔ کی شاعری کے بعض اہم عناصر،مثلاً رازِ ہستی،تخیل جنت،پند و نصائح،تصورفنا،غالب سرورِ کائنات کے حضور میں وغیرہ پر ضمنی عنوانات کے تحت شمس نے تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔شمس کی اس تنقیدی تصنیف کے مطالعہ سے وضاحت ہوتی ہے کہ انکا ناقدانہ مزاج و اسلوب بنیادی طور پر تاثراتی ہے۔تاثراتی طرز اظہار کی نشاندہی کتاب کا مطالعہ شروع کرنے کے ساتھ ہو جاتی ہے۔کلام غالبؔ پر اظہار خیال کرتے ہوئے احمد حسین شمس لکھتے ہیں:۔

''غالب نے ساز چھیڑا اور نغمے نے دردناک صورت اختیار کرلی ع

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا یہ مصرع بجائے خود ایک مکمل دیوان ہے۔یہ تفسیر حیات ہے۔صرف انسان کی نہیں،ساری کائنات کی۔اسکی حقیقت اور کنہیات کو اگر سمجھنا ہوتو کسی مُلّا سے نہیں،کسی مارکسسٹ سے نہیں،آئین اسٹائن اور بر ٹرینڈ رسل سے نہیں بلکہ کسی ویدانتک اور خرقہ پوش صوفی سے پوچھو،وہ نہیں کہے گا کہ یہ مرزا اسداللہ خاں کے دماغ کی اُپج نہیں مرزا نوشہ کے انسانی ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ یہ غالبؔ کا مدھر بول ہے۔'' (غالبؔ کی باتیں از شمس بمن گرامی ۶)

تاثرات کا یہی بیانیہ انداز ہر جگہ موجود ہے۔کلام غالبؔ کو سمجھنے اور اسکی قیمت مقرر کرنے کے سلسلہ میں شمس بمن گرامی نے اپنے مطالعہ اور جائزہ کے ردعمل ہی کو اصل معیار بنایا ہے۔یہ اسلوب تنقید نیاز فتحپوری کے طرز تنقید کی یاد دلاتا ہے۔غالب نے اپنی شاعری میں جن عناصر و اجزاء کو استعمال کیا تھا،انکی جستجو اور تقویم کے سلسلہ میں شمس نے جو ناقدانہ رویہ اختیار کیا ہے،اسکی ایک مثال درج ذیل اقتباس ہے،جسمیں انہوں نے

غالب کے صوفیانہ مزاج پر روشنی ڈالی ہے:۔

"حاصل تصوف اگر صرف معرفت ہے تو ہمیں کہہ لینے دیجئے کہ یہ شاعر (غالب) اس بے بہا دولت سے مالا مال ہو چکا تھا۔ اسکا سینہ اس نور سے معمور ہو چکا تھا جسکے حصول کیلئے آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کی ضرورت ہے۔ شاعری اگر شاعر کے دل کی آواز ہے، اگر اسکے خیالات کی ترجمان ہے اور اگر اسکے رازِ سربستہ کی عقدہ کشا اور ایقان کی آئینہ دار ہے، تو پھر غالبؔ اپنی صحیح صورت میں اپنی حقیقی موڈ (Mood) میں اگر کہیں نظر آتا ہے تو اپنے شعروں ہی میں۔ غالب پر حقیقت ہستی کھل چکا تھا۔ اسکی آنکھوں سے پردہ اُٹھ چکا تھا۔" (غالبؔ کی باتیں ۲۴)

یہ ذاتی تاثرات ہی کے انداز ہیں۔ کلام غالبؔ کے مختلف پہلوؤں نے شمس بمن گرامی پر جو اثرات قائم کئے، ان کو تنقید نگار نے قلمبند کر دیا ہے۔ غالب نے اپنے شعروں میں جو حدیث دل بیان کی، واردات قلب کی جن کیفیتوں کو پیش کیا، وجدان وعرفان کے جو مرحلے طے کئے، ان کے جائزے سے وضاحت ہوتی ہے کہ انہوں نے شاعری کو تخلیق کاری کا اعلیٰ معیار بخشا۔ حسن وعشق کے موضوعات کے برتاؤ میں جو فرسودگی اور رسم آرائی آ گئی تھی۔ غالبؔ نے اس سے بھی انحراف کیا اور حسن وعشق کے موضوعات کو بھی ایک نئے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ شمس بمن گرامی غالب کی شاعری کے اس پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حسن کو بے نقاب دیکھنے کی تمنا کسے نہیں، مگر یہ وہ منزل ہے جہاں تک پہنچنے کیلئے ہزاروں کٹھنائیاں اور بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی بن کر سامنے آ جاتا ہے اور کبھی مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش کی صورت

میں جلوہ گر ہو کر راستہ روک لیتا ہے۔ کبھی دنیا اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ اپنی طرف بلاتی ہے، کبھی انسان کی خودی اسے راہ سے بے راہ کر دیتی ہے۔ در پردہ یہ سب دھمکیاں نہیں تو اور کیا ہیں۔ غالبؔ نے دنیا والوں کو اسکی طرف متوجہ کیا اور اپنی مثال دے کر سمجھایا کہ بیشک تمہاری نگاہیں اسلئے ہیں کہ محبوب کی قدرت کاملہ کا معائنہ کرو مگر اسکے معنی یہ نہیں کہ ان لوازمات ہی کو اپنا دل سونپ دو۔ اپنا ایمان اتنا مضبوط رکھو کہ ہزاروں رنگینیاں ہی کیوں نہ نظروں کے سامنے آجائیں مگر تمہارا دل انکی طرف ہرگز راغب نہ ہو۔''

(غالبؔ کی باتیں ۵۵)

اقتباس بالا میں تنقید نگار نے کاوش کی ہے کہ غالب کے انداز احساس اور طرز فکر کی صحیح تفصیل سامنے آجائے۔ شمس بمن گرامی نے اپنی تنقیدی تحریروں میں جو تجزیاتی روش اختیار کی ہے وہ بہر حال تاثراتی نوعیت ہی رکھتی ہے۔ ایک باشعور تنقید نگار کی حیثیت سے انہوں نے ناقدانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ محض اپنے تاثرات کو قلمبند کر دینا کافی تصور کرتے ہیں۔ کہیں کہیں انکی تنقید خطابت کا رنگ اختیار کر گئی ہے اور اظہار تاثر کے دوران ناصحانہ ہے۔ انہوں نے پند و نصیحت کی باتیں بیان کی ہیں۔ لیکن انکا یہ ناقدانہ خیال صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وعظ و نصیحت کے عناصر تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان عناصر کا استعمال انہوں نے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ نصیحت کی باتیں بھی شاعرانہ فنکاری کی تابع ہیں۔ غالب نے انسانی نفسیات اور بشری زندگی کی داخلی کیفیات کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے شعروں میں منتقل کیا ہے، اسکی کوئی اور مثال مشکل ہی سے مل سکے۔ غالب کی غزلوں کے مطالعہ کے دوران یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہوں نے اشعار غزل کے ذریعہ نصیحتیں کی ہیں، ہرگز مناسب اور مستحسن نہیں

ہے۔ شمس بمن گرامی کی تنقیدی تحریروں کے جائزے سے مترشح ہے کہ انہوں نے کلام غالب کے بعض بنیادی پہلوؤں کی روشنی میں جو تاثرات اخذ کئے ہیں انکی وضاحت اور پیش کشی ہی کو انہوں نے کافی تصور کرلیا ہے۔ شمس کے اس نوعیت کے مضامین تنقیدی مزاج تو ضرور رکھتے ہیں، لیکن ان کو معیاری تنقید کا نمونہ قرار دینا محل نظر ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شمس بمن گرامی تنقید کے تقاضوں اور تنقید نگار کی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اسکے باوجود شمس کے یہ مضامین لائق توجہ ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے یہ تنقیدی مضامین اس عہد میں قلمبند کئے کہ جب تنقید نگاری کا شعار بہار کے تنقید نگاروں میں عام نہ ہوسکا تھا۔ بہار میں تنقید کی روایتوں کی تشکیل جدید کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں کلیم الدین احمد اختر اور ینوی اور عطا کاکوی کے علاوہ دور زیر تذکرہ میں کسی اور تنقید نگار کی جستجو اور نشاندہی اور مشکل بن جائے گی۔ شمس کے ان مضامین کی اہمیت اسی لئے موجود ہے۔ بہار کی اردو تنقید نگاری کے ارتقائی تسلسل کے جائزے کے دوران شمس بمن گرامی کی ناقدانہ اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ بہار کے سرمائیہ تنقید میں اضافے کی کاوشیں انہماک واخلاص کے ساتھ کی ہیں چونکہ شمس بمن گرامی کی تنقید نگاری کسی خاص نقطۂ نظر کی پابند نہیں رہی ہے، اسلئے انکی تنقیدی تحریروں میں تاثرات حاوی نظر آتے ہیں، اسکے باوجود انکی قدر و قیمت فراموش نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ادبی تخلیقات اور ادبی شخصیات کے مطالعے اور جائزے کے دوران انہوں نے اپنی قوت فہم وفکر ہی پر اعتماد کیا ہے۔ انہوں نے گویا آزاد خیالی اور وسیع المشربی کی راہ اختیار کی ہے۔ تنقیدی جائزوں کے دوران ذہن شاعر کے تجزیے کا انداز ملاحظہ ہو:۔

''انسان کی موجودہ پستی اور ذلت کو دیکھ کر غالب کا دل رو اُٹھا۔ اسکی نظروں کے سامنے وہ منظر آئے ایک وہ کہ فرشتے انسان کو سجدہ کرر ہے ہیں، اور دوسرا وہ کہ یہی شاہد مطلق کے سوا ہر اس چیز کے سامنے سرِ نیاز جھکا رہا ہے جو درجے میں انسان سے کمتر ہے، کتنا متضاد واقعہ ہے یہ۔ ایک وہ منظر تھا کہ جو ہماری رفعت کا اظہار کرر ہا ہے اور ایک یہ منظر ہے جو ہماری پستی و ذلت کا آئینہ دار ہے۔'' (غالبؔ کی باتیں ۴۷)

غالب کے انسان دوستی کے شعار کو سمجھنے اور پرکھنے کی یہ کوشش اثر خیز ہے۔ شمس بمن گرامی کی تنقیدی تحریروں کے جائزے سے اسکی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی تنقیدوں کیلئے جو زبان استعمال کی ہے وہ تنقید کی معیاری اور مدلل زبان نہیں ہے۔ اسکے اندر منطقیت سے زیادہ جذباتیت ہے۔ زبان و بیان میں احساس کی لطافت تو ہے، تجزیے کی بصیرت پوری طرح نمایاں نہیں ہے۔ مغربی ادیبوں اور شاعروں کے جابجا حوالے ملتے ہیں۔ لیکن ان حوالوں میں بھی استناد و استدلال کا شعور بہت کم ہے۔ نیاز فتح پوری کے ناقدانہ مزاج و اسلوب سے وہ قریب تر نظر آتے ہیں۔ اگر انہوں نے تنقید نگاری سے اپنے گہرے شغف کو برقرار رکھا ہوتا اور تنقیدی مضامین لکھتے رہنے کی کاوشیں جاری ہوتیں تو پھر انکے ناقدانہ شعور میں پختگی، بالیدگی، تہہ داری اور فکری بصیرت میں یقیناً نئے امکانات نمایاں ہوتے۔

مذہبیات

مذہبیات کے معاملات ومسائل پر بھی شمس بمن گرامی نے اظہار خیال کیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے کسی دینی تعلیم گاہ میں علم دین حاصل نہیں کیا۔لیکن اپنے ذاتی مطالعے کی بنیاد پر بعض نمایاں مسئلوں پر انہوں نے اپنے خیالات ومشاہدات کو پیش کیا ہے۔اس نوعیت کے مضامین میں تاریخی وتحقیقی دلائل سے مصرف لے کر وہ اپنے خیالات کو زیادہ اہم بنالیتے ہیں۔مثلاً ہندی زبان میں انہوں نے ایک کتابچہ قلمبند کیا ہے جسکی اشاعت ابھی نہیں ہوسکی ہے۔اسکا موضوع ہے۔''رحمت الاالعالمین'' یہ کتاب ہندی رسم الخط میں تو ہے مگر اسکی زبان بہر حال اردو ہی ہے۔اسکے علاوہ بعض مضامین رسائل میں چھپے ہیں، جنکے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ وتحقیق سے بھی وہ گہرا شغف رکھتے ہیں۔

اپنے ایک شائع شدہ مضمون میں شمس بمن گرامی نے حضرت موسیٰؑ اور شری کرشن جی سے متعلق تحقیق کی ہے اور بعض تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ ہی کا ایک رُخ شری کرشن جی کی صورت میں سامنے آیا۔حضرت موسیٰؑ کی کہانی مصریوں کے ذریعہ ہندوستان آئی۔یہ مصری لوگ وہ ہیں جو مہاتما بدھ سے قبل ہندوستان آئے تھے اور یہیں سکونت پذیر ہوئے تھے۔چونکہ مصریوں کی یہ جماعت تعلیم یافتہ تھی اسلئے برہمنوں نے اسے اپنے سماج کا حصہ بنالیا۔انہیں مصری برہمن کہا جانے لگا۔انہیں کے ناموں کا آخری جزءمصر (مشر) ہے۔''مشرا) مصرا کا گویا مفہوم یہ ہے کہ ایسے برہمن جو ہندوستانی برہمنوں میں جذب کرلئے گئے۔ان لوگوں کے ناموں کا یہ لاحقہ انکے نثراد ہونے کا اشاریہ ہے۔بعض اور اہل قلم حضرات نے اس تاریخی پہلو پر

روشنی ڈالی ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں ایک جماعت جوگم ہو چکی تھی، وہ کشمیر ہی میں آ کر بسی تھی۔ بہر حال انہیں مصریوں نے حضرت موسیٰ کی کہانی کو ہندوستان میں عام کیا اور پھر کچھ عرصہ بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ کرشن جی یا موسیٰ کا مسکن ہندوستان ہی ہے۔ اسی طرح ''مدین'' کو ''مدھوبن'' میں تبدیل کر دیا گیا۔

ایک اور مضمون میں شمس نے ایک متنازعہ مسئلہ پر مذہبی بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ بھی کتابچہ کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اسمیں انہوں نے عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کے ذریعہ وضاحت کی ہے کہ سور کا گوشت مسلمانوں ہی کی طرح انکے لئے حرام ہے۔ لیکن انہوں نے اس ممنوع شئے کو اپنے لئے جائز کر رکھا ہے۔ اسی طرح گائے کا گوشت ہندوؤں کے لئے جائز ہے۔ لیکن انہوں نے گائے کی پرستش کر کے اسکے گوشت کو اپنے لئے حرام کر رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انکا خیال یہ ہے کہ مصری جو لوگ یہاں آ گئے تھے انہوں نے گائے کی الوہیت کا پرچار کیا اور اس جانور کو مقدس قرار دے کر اسکی پرستش شروع کر دی۔

بہر نوع اس طرح کے مضامین شمس بمن گرامی کے مطالعۂ مذہبیات کے اثرات کو سامنے لاتے ہیں اور اسکا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بعض مذہبی مسئلوں کو گہرے مطالعے کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسطرح کے مضامین میں انہوں نے نہایت صاف وسادہ زبان استعمال کی ہے اور اپنے زور استدلال سے ان مضامین کو زیادہ توجہ طلب بنا دیا ہے۔

اردو ادب میں ان کی منفرد خدمات

گذشتہ ابواب میں شمس بمن گرامی کی جن ادبی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، انکی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شمس نے شعروادب کے مختلف اسالیب واضاف سے اپنی وابستگی رکھی ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی تحریروں میں متعلقہ عہد کی شخص اور معاشرتی زندگی کے پُرخلوص مشاہدات وتجربات سے پہنچنے والے تاثرات کو قلمبند کیا ہے اور تنقیدی تحریروں کے ذریعہ ادبی تخلیقات کو پرکھنے کی، انکے مفاہیم ومطالب کودریافت کرنے کی کاوشیں کی ہیں۔

شمس کی مجموعی ادبی خدمات جائزے سے مترشح ہے کہ انہوں نے شاعر کی حیثیت سے اپنی تخلیقی بصیرت وذہانت کے اظہار میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ ایک حساس قلب اور بیدار ذہن کے حامل ہیں۔ انہوں نے انسان کی زندگی اور اسکے متعلقات ومعاملات پر گہری نگاہ رکھی ہے۔ معاشرے کی تغیر پذیر روایتوں نے عصر حاضر کے انسان کی زندگی میں جن تلخیوں کو آمیز کیا ہے، جن الجھنوں اور محرومیوں کوفروغ دیا ہے، جن کرب انگیز صداقتوں سے اسے دوچار کیا ہے اور ان سب کی وجہ سے جذبہ واحساس کا جوردعمل اس پر ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے شعری لب ولہجہ کوعصر حال کی توانائی اور کشش آمیز بصیرت سے ہم آہنگ رکھا ہے مشینی اور میکانکی طرز حیات نے موجودہ دور کے انسانی معاشرے میں جن تلخیوں اور صعوبتوں کوجنم دیا ہے، انکی تصویریں، احساس کی لہروں سے ہم آہنگ ہیں۔ شمس کے مشاہدات میں تنوع ہے۔ احساسات میں تازگی ہے۔ وجدان وفکر میں وسعت وشادابی ہے اور انکی شاعرانہ بصیرت انفرادی اور اجتماعی

زندگی کے تمام نشیب وفراز سے پیدا ہونے والے ردعمل کوفنی چابکدستی سے پیش کرنے کے سلیقے سے آشنا ہے۔لفظ و بیان اور ہیئت وساخت کی جہتوں سے بھی شمس کی تخلیقات تازگی وشادابی رکھتی ہیں۔ان میں ژولیدگی یا پیچیدگی نہیں ہے، یہ مبہم یا گنجلک نہیں ہیں۔ انہوں نے نظموں کے نئے سانچوں کی تخلیق وتشکیل کی ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے خیال وجامۂ خیال کے مزاج کو برتنے کی کوشش کی ہے۔انسانی قدروں کی شکست وریخت نے اضطراب والتہاب کی جو المناک صورتحال پیدا کررکھی ہے، شمس کی شاعری، اسکی حقیقت آفریں ترجمانی کرتی ہے۔لیکن انہوں نے سماجی حقیقت نگاری کی وہ راہ اختیار نہیں کی جسکی وضاحت درج ذیل سطور میں سردار علی جعفری نے کی ہے:۔

''اسکے معنی یہ ہیں کہ موضوع کی سماجی اہمیت ہونی چاہئے ،یعنی ایسا موضوع جو انسان کی زندگی ،ماحول ٹکراؤ، تضاد، جدوجہد، کشمکش، جنبش اور حرکت کا ترجمان ہو۔جسکے ذریعہ سے سماج اور تاریخ کے عوامل اور روابط نمایاں ہوسکیں یعنی موضوع حقیقی اور سچا ہونا چاہئے۔اسلئے ترقی پسند مصنفین خود موضوع اختراع کرنے کے بجائے زندگی اور سماج سے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔'' (ترقی پسند ادب از علی سردار جعفری ۸۳)

اقتباس بالا کی اخیر توجہ طلب ہیں۔زندگی اور سماج سے موضوع کا انتخاب صرف ترقی پسند مصنفین ہی نے نہیں کیا۔یہ درست ہے کہ ترقی پسندوں نے سماجی کشمکشوں کی آئینہ داری پر زور دیا ہے،لیکن اسکے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جو حضرات ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ تھے،انہوں نے بھی اپنے ادب کا موضوع،زندگی اور سماج ہی سے اخذ کیا ہے۔شمس بمن گرامی کی شاعری بھی اسکی مثال کے طور پر ہمارے

پیشِ نظر ہے۔ ہاں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا درج ذیل خیال صداقت کا حامل ہے کہ:۔

''سماجی زندگی میں سائنس کی ترقی نے عقلیت اور حقیقت پسندی کے رجحان کو کبھی دبنے نہ دیا اور ادبی ذہن سائنسی نقطۂ نگاہ، عقلیت اور توازن کے خلاف گاہے گاہے رومانی تخیلات کی دنیا آباد کرنے کے ساتھ ساتھ ٹھوس زمین پر سوچنے کی قوتوں سے بھی آراستہ رہا اور ادیبوں اور شاعروں کے گردو پیش کی معاشرتی زندگی کو حقیقت پسندی سے مطالعہ کرنے کی عادت ترک منزل پر رومانوی دھندلکوں سے مراجعت کرنے کی ترغیب دی اور سنگلاخ حقائق کا سامنا کرنے کی ہمت عطا کی۔اس سے ادب میں حقیقت نگاری کو فروغ ملا۔''

(جدید اردو نظم اور یورپی اثرات ۲۵۹)

ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کے میلان کو عام بنا دیا اور ہر نقطۂ نظر کے ادیبوں اور شاعروں نے زندگی ہی سے تخلیق کے موضوعات کو اخذ کرنا شروع کیا۔اس سلسلہ میں ترقی پسند مصنفین کو کوئی تخصیص حاصل نہیں ہے۔شعر وادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت خود بہ خود سامنے آجاتی ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے ربع حصے میں تو رومانی اثرات موجود اور پسندیدہ تصور کئے جا رہے تھے۔لیکن رفتہ رفتہ یہ زائل ہونے لگے اور پھر رومانی دھندلکوں سے احتراز کرنے کا میلان بالکل عام ہو گیا۔ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، دونوں ہی حلقوں کے ادیبوں اور شاعروں نے شخص اور سماجی زندگی کے معاملات ومسائل سے موضوعات اخذ کئے۔شمس بمن گرامی اگر چہ ترقی پسند تحریک میں باضابطہ شامل نہ ہوئے۔لیکن انکی غزلوں اور نظموں میں بھی زندگی کی صداقتوں کا ظہور واضح ہے۔کہیں کہیں تو انکی صداقت شعاری کا لب ولہجہ تلخ اور سخت بھی ہو گیا ہے۔

ادبی تنقید کی روایتوں کو بھی شمس نے فروغ دینے کی کاوشیں کی ہیں۔لیکن مجموعی طور پر انکی تنقیدی تحریریں، تاثراتی رنگ ومزاج کی حامل ہیں۔اس اعتبار سے انکی تنقیدی تحریریں، نیاز فتحپوری کے ناقدانہ مزاج واسلوب سے قریب تر ہیں۔شمس کے شگفتہ ومنفرد اسلوب تحریر نے انکی تنقیدی تحریروں کو جاذب تو بنادیا ہے لیکن ان میں تجرباتی بصیرت نمایاں نہیں ہے۔وہ تاثرات کی نازک لہروں کے سہارے، تنقید کے مراحل طئے کرنے کی کاوشیں کرتے رہے ہیں۔اگر تنقید نگاری کی شغل سے انکا رابطہ گہرا ہوتا اور تنقید نگاری کی طرف انہوں نے انہماک کے ساتھ توجہ دی ہوتی تو یقیناً تنقیدی ادب میں بھی انکی ادبی خدمات امتیازی نوعیت کی حامل ہوتیں۔تنقیدی تحریروں کا جو سرمایہ بھی موجود ہے، اسکے جائزے سے انکے تنقید کی انفرادیت بخوبی سامنے آجاتی ہے۔انہوں نے تنقیدی روایتوں کے ایک خاص تاثراتی انداز کو خوبصورتی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔بہرنوع شمس کی یہ ادبی خدمات، بہار کے ادبی سرمائے میں ایک قابل قدر اہمیت رکھتی ہیں۔

★★★

احمد حسین شمس بمن گرامی